Globethics Repository

Ma'arif Ayat al-Kursi (PART 1)

This page was generated automatically upon download from the Globethics Repository. More information on Globethics see https://www.globethics.net. Data and content policy of Globethics Repository see https://repository.globethics.net/pages/policy.

Item Type	Book
Authors	Al-Qodiri, Muhammad Thohir
Publisher	Manshurat Minhaj al-Quran
Rights	With permission of the license/copyright holder
Download date	2026-07-10 20:52:42
Link to Item	http://hdl.handle.net/20.500.12424/187145

معارفِ آیۃ الکرسی

اَز اِفادات

مرتبہ:
محمد عمر حیات الحسینی

مِنہاجُ القرآن پبلیکیشنز

365-ایم، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 5168514، 042-111-140-140

یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور، فون: 042-7237695

www.Minhaj.org - sales@Minhaj.org

منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش

www.MinhajBooks.com

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَآئِمًا اَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِمِ

مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الْکَوْنَیْنِ وَالثَّقَلَیْنِ

وَالْفَرِیْقَیْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ

جملہ حقوق بحقِ تحریکِ منہاجُ القرآن محفوظ ہیں

نام کتاب	:	معارِفِ آیۃ الکرسی
اَز اِفادات	:	شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری
مرتبہ	:	محمد عمر حیات الحسینی، اَجمل علی مجددی
نظرِ ثانی	:	ڈاکٹر علی اَکبر الازہری
زیرِ اِہتمام	:	فریدِ ملّت ؒ رِیسرچ اِنسٹی ٹیوٹ Research.com.pk
مطبع	:	منہاجُ القرآن پرنٹرز، لاہور
اِشاعتِ اَوّل	:	ستمبر 2007ء
تعداد	:	1,100
قیمت پریمئر کاغذ	:	-/250 روپے

نوٹ: شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تمام تصانیف اور ریکارڈڈ خطبات و لیکچرز سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی اُن کی طرف سے ہمیشہ کے لیے **تحریکِ منہاجُ القرآن** کے لیے وقف ہے۔

(ڈائریکٹر منہاجُ القرآن پبلی کیشنز)

sales@minhaj.org

جملہ حقوق بحقِ تحریکِ منہاجُ القرآن محفوظ ہیں

نام کتاب : معارِفِ آیۃ الکرسی

اَز اِفادات : شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

مرتبہ : محمد عمر حیات الحسینی، اَجمل علی مجددی

نظرِ ثانی : ڈاکٹر علی اَکبر الازہری

زیرِ اِہتمام : فریدِ ملّت ؒ رِیسرچ اِنسٹی ٹیوٹ Research.com.pk

مطبع : منہاجُ القرآن پرنٹرز، لاہور

اِشاعتِ اَوّل : ستمبر 2007ء

تعداد : 1,100

قیمت VRG کاغذ : -/340 روپے

نوٹ: شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تمام تصانیف اور ریکارڈڈ خطبات و لیکچرز سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی اُن کی طرف سے ہمیشہ کے لیے **تحریکِ منہاجُ القرآن** کے لیے وقف ہے۔

(ڈائریکٹر منہاجُ القرآن پبلی کیشنز)

sales@minhaj.org

فہرس

صفحہ	مشتملات
۲۳	پیش لفظ
۲۹	آیۃ الکرسی
۳۰	مفردات اور جملوں کی تشریح
۳۳	آیت الکرسی کے فضائل
۳۳	سورتوں کے فضائل کے بارے میں ایک غلط فہمی کا ازالہ
۳۵	تعلیمِ نبوی ﷺ کا منہاج
۳۶	شیطان اور جن کا چوری کرنا
۳۹	فوائدِ حدیث
۵۰	آیت الکرسی کے فضائل کا خلاصہ
۵۱	لطائف
۵۲	آیت الکرسی کے جُملوں میں منطقی ربط
۵۶	آیت الکرسی اور اسماء و صفاتِ باری تعالیٰ
۵۷	آیت الکرسی ربط بین الآیات کی روشنی میں

منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش

www.MinhajBooks.com

صفحہ	مشتملات
	مشتملات

مشتملات	صفحہ
آیت الکرسی کے عارفانہ نکات	٦٠
قلب پاک ہوتو ہر اسم، اسمِ اعظم ہے	٦٠
اَللّٰهُ لَا اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ کا معنیٰ	٦٣
لفظِ اللہ کے تفسیری معارف	٦٣
لفظِ اللہ جامع اور مانع شان کا حامل ہے	٦٥
نفی و اثبات کی حکمت	٦٥
اشتقاقی مادہ کے لحاظ سے لفظ اللہ کے معانی	٦٦
صفاتِ خداوندی اور کائناتی نظام	٦٩
ذاتِ واجب الوجود کو بادشاہوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا	٧٠
ایمان باللہ کا صحیح مفہوم	٧٢
قُربتِ خداوندی کا معنیٰ	٧٤
اِلٰہ کا معنیٰ	٧٦
ذاتِ واجب کا تصور انسانی فطرت کی آواز ہے	٧٧
صفاتِ خداوندی کے بارے میں گمراہ اقوام کی افراط و تفریط	٨٠
تشبیہ اور تعطیل کے مابین اعتدال کا راستہ	٨١

مشتملات	صفحہ
آیت الکرسی میں توحید کا ایجابی اور سلبی پہلو	۸۲
اَلْحَيُّ کا معنی	۸۴
حیات کیا ہے؟	۸۴
حیات کی کُنہ کو سمجھنا ناممکن ہے	۸۷
مراتبِ حیات کیا ہیں؟	۸۸
مادہ پرستوں کے انکار کا جواب	۸۹
آیت الکرسی خوابیدہ عقول کو بیدار کرنے والی ہے	۸۹
عُقلا کے لئے دعوتِ فکر	۹۱
زندگی کی طرح موت بھی ایک حیرت انگیز حقیقت ہے	۹۱
عذابِ قبر	۹۳
دو موتیں	۹۴
دو زندگیاں	۹۵
اللہ تعالیٰ ایک زندہ حقیقت ہے	۹۷
حمد و تسبیحِ الٰہی حصولِ صبر و توکل کا وسیلہ ہے	۹۸
حقیقی زندگی کا سرچشمہ ذاتِ واجب الوجود ہے	۹۹
ہر طرح کی زندگی کا اظہار الحيُّ کی صفت کا مرہونِ منت ہے	۱۰۳

www.MinhajBooks.com

صفحہ	مشتملات
۱۰۴	طبیعی موت انسان کے محض جسم پر وارد ہوتی ہے
۱۰۸	سلسلۂ کائنات ہمیشہ رہنے والا نہیں
۱۱۰	**اَلْقَیُّوْمُ کے معانی و مطالب**
۱۱۰	اَلْقَیُّوْمُ کا پہلا معنٰی
۱۱۱	خُدا خاموش علت العلل نہیں ہے
۱۱۳	ہر شے لوازم حیات سے آراستہ ہے
۱۱۴	نظامِ کائنات قدرتِ خداوندی کی حکیمانہ تدبیر کا زندہ ثبوت ہے
۱۱۵	الحيّ القیّوم کے بلا عطف استعمال ہونے کی حکمت
۱۱۶	اَلْقَیُّوْمُ کا دوسرا معنٰی: ازلی وجود کا مالک
۱۱۶	وجودِ باری تعالیٰ کے بارے میں جدید ذہنوں کے شکوک وشبہات کا ازالہ
۱۱۸	اَلْقَیُّوْمُ کا تیسرا معنی
۱۱۹	یا حیّ یا قیّوم کا ورد ہر درد کی دواء ہے
۱۲۱	صفتِ قیوم اور مسئلہ جبر وقدر
۱۲۴	(الف) خلقِ عمل اور کسبِ عمل میں فرق
۱۲۷	کیا مخلوق ہونے کے لئے دیکھا جانا ضروری ہے؟

www.MinhajBooks.com

مشتملات	صفحہ
جزا و سزا کا تعلق کسب سے ہے نہ کہ خلق سے	۱۲۸
ایک غلط فہمی کا ازالہ	۱۳۰
(ب) انسان کے مختار یا مجبور ہونے کا مسئلہ	۱۳۲
بین القدر والجبر کا مفہوم	۱۳۳
۱۔ فرض اور خواہش میں کش مکش کا مرحلہ	۱۳۳
۲۔ غور و خوض کا مرحلہ	۱۳۴
۳۔ انتخابِ نیت کا مرحلہ	۱۳۴
۴۔ عزم و ارادے کا مرحلہ	۱۳۴
۵۔ تعمیل کا مرحلہ	۱۳۵
۶۔ نتیجۂ عمل کا مرحلہ	۱۳۵
اللہ تعالیٰ کا تصوّرِ عدل	۱۴۱
عدل کا مقامِ رفیع ۔۔۔۔ احسان	۱۴۳
اللہ تعالیٰ کی احسان پسندی	۱۴۵
اللہ تعالیٰ اگر بندے کو مجبور کرنا چاہے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا	۱۴۶
جزا و سزا اور نظامِ عدل	۱۴۷
جزا و سزا اور اتمامِ حجت	۱۴۸

صفحہ	مشتملات

مشتملات	صفحہ
اتمام حجت کا مفہوم	۱۵۱
اخلاقی جدوجہد	۱۵۲
حالتِ اضطرار اور قانونِ اسلامی	۱۵۴
سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا ارشاد	۱۵۷
سلطنتِ اسلامیہ کا فرض	۱۵۷
سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک مقدمہ	۱۵۸
ایک صحابی کا سوال اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جواب	۱۵۹
لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ کا معنٰی	۱۶۱
اُونگھ اور نیند نہ آنے کی وجہ	۱۶۱
نیند مخلوق کی فطری ضرورت ہے	۱۶۲
دن اور رات کو اکٹھا بیان کرنے کی حکمت	۱۶۵
’’سنۃ‘‘ کو ’’نوم‘‘ سے مقدّم کیوں کیا؟	۱۶۶
لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ کا معنٰی	۱۶۷
اللہ تعالیٰ کی ملکیت پر ایمان، فکر کو درست رکھنے میں گہرا اثر ڈالتا ہے	۱۶۸
لامِ اختصاص کی حکمت	۱۷۰
آیت الکرسی اور تصور ملکیت	۱۷۲

www.MinhajBooks.com

مشتملات	صفحہ
انسانی ملکیت کی حدود	۱۷۲
حکومتِ خداوندی سے فرار ممکن نہیں	۱۷۴
کیا حاکمیت اور قیومیتِ خداوندی تکوینی قوانین کے ذریعے نافذ ہے؟	۱۷۵
مؤمن اور غیر مؤمن کا رویہ	۱۷۸
اسلامی تربیت کی اساس	۱۸۰
ملکیت اور تسخیرِ خداوندی	۱۸۲
تصورِ ملکیت	۱۸۹
۱۔ ملکیت کی لغوی تحقیق	۱۹۱
۲۔ مفہومِ ملکیت	۱۹۱
۳۔ ملکیت کی تعریف	۱۹۲
۴۔ مالک اور ملکیت میں افادیت کا پہلو	۱۹۲
۵۔ بالقوہ افادیت اور بالفعل افادیت	۱۹۵
۶۔ علّتِ ملکیت	۱۹۶
۷۔ حقِ انتفاع کی حقیقت	۱۹۸
۸۔ حقِ تملّک کی حقیقت	۲۰۱
(ا) حقِ تملک: قرآن مجید کی روشنی میں	۲۰۱

www.MinhajBooks.com

مشتملات	صفحہ
(۲) حقِ تملّک : احادیث کی روشنی میں	۲۰۴
(۳) حقِ تملّک : فقہ اسلامی میں	۲۰۶
۹۔ انفرادی حقِ ملکیت	۲۰۶
۱۰۔ حقِ ملکیت کی صحت و مشروعیت کی شرائط	۲۰۷
۱۱۔ زائد از ضرورت مال کی شرعی حیثیت	۲۱۱
۱۲۔ حقِ تملّک اور حقِ انتفاع میں فرق	۲۱۳
۱۳۔ ارتکازِ دولت کی حیثیت	۲۲۳
تحدیدِ ملکیت	۲۲۵
تحدیدِ ملکیت کے منافی نقطہ نظر رکھنے والوں کے دلائل اور ان کا ردّ	۲۲۶
بحث کا ماحصل	۲۴۳
انسان اور کائنات	۲۴۳
اسلام کا تصوّرِ عبادت	۲۴۵
انسان کے عدمِ سکون اور اضطراب کی وجہ	۲۴۷
سعادت کا بنیادی رکن امن و امان کا قائم رہنا ہے	۲۴۹
مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ کا معنٰی	۲۵۲
شافع و مشفوع دونوں ملکیتِ خدا ہیں	۲۵۳

مشتملات	صفحہ
نفی و اثبات کی حکمت	۲۵۳
دنیاوی سفارش اور عقیدہ شفاعت کے مابین فرق	۲۵۴
شفاعت ارادۂ الٰہی کے منافی نہیں	۲۵۷
توبہ اور شفاعت	۲۵۷
دعا، اِستغفار اور عقیدۂ شفاعت	۲۵۸
مشرکین کا جذبہ اور اُس کا محرّک	۲۶۰
مشرکین کے شرک کا معیار	۲۶۱
باطل طرزِ فکر کی اصلاح	۲۶۲
ثبوتِ شرک کے لئے نفیٔ توحید کی بالصراحت ضرورت ہوتی ہے	۲۶۳
مبادیاتِ الٰہیات کو بغور سمجھنے کی ضرورت ہے	۲۶۴
تضاد کے تعیّن کا منہاج	۲۶۴
توحید اور شرک کے تعیّن کا منہاج	۲۶۵
توحید اور شرک میں بُعد المشرقین	۲۶۷
عبادت اور دُعا میں فرق	۲۶۸
قرآن حکیم میں لفظِ دُعا کے معانی	۲۷۲
۱۔ دُعا بمعنی دعوت	۲۷۲

مشتملات	صفحہ
۲۔ دُعا بمعنی التجا	۲۷۵
۳۔ دُعا بمعنی عبادت	۲۷۸
مقربینِ بارگاہِ الٰہی کی شفاعت حق ہے	۲۸۱
آیت کا صحیح مفہوم	۲۸۳
آیات کا اصل منشاء یہ ہے کہ مشرکین غیر خدا کی عبادت کرتے ہیں	۲۸۴
مسئلہ شفاعت کی شرعی حیثیت	**۲۸۶**
شفاعت اور تصورِ بخشش و مغفرت	۲۸۷
بخشش و مغفرت کا مرکز و محور ذات مصطفیٰ ﷺ ہے	۲۸۸
صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل کی روشنی میں بخشش و مغفرت کا تصور	۲۸۸
شفاعت اور دعا کا باہمی تعلق	۲۹۰
شفاعت پر بعض بے بنیاد اعتراضات کا بطلان	۲۹۱
شفاعت کے عدم جواز کے غلط استدلال کا بطلان	۲۹۳
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شفاعت طلبی	۲۹۵
شفاعت کا مادۂ اشتقاق اور اس کا مفہوم	۲۹۸
لفظ شفع کے اطلاقات	۲۹۹
مفہوم شفاعت	۳۰۰

www.MinhajBooks.com

مشتملات	صفحہ
شفاعت کی اَقسام	۳۰۱
۱۔ شفاعت فی الدنیا	۳۰۱
۲۔ شفاعت فی الاخرۃ	۳۰۲
مقامِ محمود، مقامِ شفاعت ہے	۳۰۳
شفاعتِ کبریٰ اور نص قرآنی	۳۰۶
۱۔ قدرۃ الشافع علی الشفاعۃ	۳۰۹
۲۔ اسلام المشفوع له	۳۱۱
نفیٔ شفاعت پر قرآنی آیات اور ان کا حقیقی مفہوم	۳۱۲
۱۔ کفار سے شفاعت کا نا مقبول ہونا	۳۱۲
قانون تعارض اور بعض مفسرین کی تصریحات	۳۱۳
۲۔ کفار سے روز قیامت دوستی اور شفاعت کی نفی	۳۱۵
۱۔ بیع کی نفی	۳۱۶
۲۔ دوستی کی نفی	۳۱۶
۳۔ شفاعت کی نفی	۳۱۶
۳۔ کفار کیلئے کوئی ولی و شفیع نہیں	۳۱۸
۴۔ مشرکین کی شفاعت کرنے والے ماذون نہیں	۳۱۹

www.MinhajBooks.com

مشتملات	صفحہ
۵۔ اللہ کو بھلا دینے والے، شفاعت سے محروم ہوں گے	۳۲۱
۶۔ کفار کی دنیا کو پلٹ جانے کی حسرت	۳۲۳
۷۔ مشرکین کی روز قیامت عدم شفعاء کی وجہ سے سخت نا اُمیدی	۳۲۴
۸۔ صداقتِ قرآن کے منکرین کی شفاعت سے محرومی	۳۲۶
۹۔ معبودان باطلہ سے نفیٔ شفاعت	۳۲۷
۱۰۔ ظالمین (کفار) کا کوئی شفیع نہ ہوگا	۳۲۸
۱۱۔ منکرین روز جزاء سے نفی شفاعت	۳۳۰
۳۔ الاذن للشافع	۳۳۳
شافعین ماذون ہیں	۳۳۴
شہادت بالحق کی وضاحت	۳۳۵
اذن شفاعت کے دو درجات	۳۳۷
۴۔ الرضا عن المشفوع لهٗ	۳۳۸
يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ کا معنٰی	۳۴۰
علمِ الٰہی اور اذنِ شفاعت میں ربط	۳۴۰
مجسم شفیع ہدایت و مغفرت	۳۴۳
شفآء کا اپنے اس مرتبہ کے لائق ہونا یقینی ہے	۳۴۳

مشتملات	صفحہ
علمِ الٰہی پر اعتقاد رکھنا صالح اعمال کی اساس ہے	۳۴۴
وَلَا يُحِيطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ کا معنٰی	۳۴۶
انسان اور دیگر مخلوقات کے علم میں فرق	۳۴۸
علیمٌ کے مختلف صفات کے ساتھ استعمال کی حکمت	۳۴۹
علمی ترقی اور علمِ الٰہی	۳۵۱
علمِ الٰہی اور انسانی ساخت	۳۵۳
علمِ الٰہی اور جدید علم نفسیات	۳۵۴
کیا خلوص نفسیاتی کیفیات کا نام ہے؟	۳۵۷
توحید فی العلم کا تصور	۳۵۸
شرک فی العلم	۳۶۰
علمِ الٰہی کی صفات	۳۶۰
عطائے الٰہی اور اِذنِ الٰہی شرک نہیں	۳۶۱
سب کو ملتا ہے فقط ان کی رضا کا صدقہ	۳۶۵
کارسازِ ذات کی بندہ نوازیاں	۳۶۶
شانِ رسالت اور مقامِ تکوین	۳۷۱

www.MinhajBooks.com

مشتملات	صفحہ
علمِ الٰہی کی وسعت کا قرآنی تصور	۳۷۳
شانِ خالقیت و مالکیت اور تصوّرِ علم	۳۷۳
اللہ تعالیٰ سے کوئی شے مخفی نہیں	۳۷۴
علمِ الٰہی کے وسیع و بسیط ہونے کا بیان	۳۷۶
اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے	۳۷۷
آیت الکرسی اور مسئلہ علمِ غیب	**۳۸۰**
''ھُم'' ضمیر کا مرجع کون؟	۳۸۱
ما بین ایدیھم و ما خلفھم کا مفہوم	۳۸۴
پہلا مفہوم	۳۸۴
دوسرا مفہوم	۳۸۶
تیسرا مفہوم	۳۸۶
چوتھا مفہوم	۳۸۸
پانچواں مفہوم	۳۸۹
چھٹا مفہوم	۳۹۰
احاطہ علم کی نفی اور مخلوق کا مرتبہ علم	۳۹۲
علم اور احاطہ علم میں فرق	۳۹۳

www.MinhajBooks.com

مشتملات	صفحہ
علمِ محیط خالق کی اور علمِ محاط بندے کی صفت ہے	۳۹۵
جزئی علمِ محاط	۳۹۹
کلی علمِ محاط	۴۰۰
علمہٖ کا مفہوم	**۴۰۳**
پہلا معنی: معلوماتِ الٰہیہ	۴۰۳
ذات الٰہی معلوم نہیں علیم ہے	۴۰۶
علم اور معرفت میں فرق	۴۰۷
معلوماتِ الٰہیہ کا علم	۴۱۰
علمہٖ کا دوسرا معنی: علم غیب	۴۱۰
علمِ غیب عطائی کا جواز وثبوت	۴۱۳
علمہٖ کا تیسرا معنی: علم بمعنی اسم مصدر	۴۱۴
صفاتِ الٰہیہ کی شانِ مظہریت	۴۱۵
۱۔ مظہرِ عزت	۴۱۶
اشتراکِ لفظی سے غلط فہمی کا ازالہ	۴۱۷
۲۔ مظہرِ قوت	۴۱۸
۳۔ مظہرِ خیر	۴۱۹

www.MinhajBooks.com

مشتملات	صفحہ
۴۔مظہرِ سمع و بصارت	۴۱۹
۵۔مظہرِ شہادت	۴۲۰
۶۔مظہرِ رافت و رحمت	۴۲۱
ہر گل میں ہر شجر میں اسی کا ظہور ہے	۴۲۲
شانِ ربوبیت کا مظہرِ اتم ..... ذاتِ مصطفیٰ ﷺ	۴۲۴
وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کا معنٰی	۴۲۷
کرسی کا معنی و مفہوم	۴۳۳
خلاصۂ اقوال	۴۳۴
وَلَا يَؤُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ کا معنٰی	۴۳۹
نظامِ کائنات اور معرفتِ ربانی	۴۵۷
آیت الکرسی اور عقیدۂ توحید	۴۶۰
صفاتِ خداوندی سے ربط و تعلق کی اہمیت	۴۶۱
صفاتِ خداوندی کا اعمالِ انسانی پر اثر	۴۶۱
عقیدۂ توحید کے ثمرات و برکات	۴۷۰
عقیدۂ توحیدِ الٰہی کے اخلاق، معاشرت، تمدن اور معیشت پر اثرات	۴۷۲

مشتملات	صفحہ
توحید کا سچا جذبہ ہی مخلوق سے محبت کرنا سکھاتا ہے	۴۷۷
توحید کے مذاہب اور اقوامِ عالم پر اثرات و برکات	۴۸۱
توحید کا فکر و عمل پر اثر	۴۸۲
عقیدۂ توحید اور احساسِ یکتائی	۴۸۴
عقیدۂ توحید اور قربتِ خداوندی	۴۸۵
توکل کی اقسام	۴۸۷
عقیدۂ توحید سے سیرت و کردار اور اخلاق کے گوشے مہک اُٹھتے ہیں	۴۸۸
عقیدۂ توحید ذہنِ اِنسانی کو سائنسی اُسلوب کی بنیاد فراہم کرتا ہے	۴۸۹
عقیدۂ توحید علمی سے بڑھ کر اہم عملی حقیقت بھی ہے	۴۹۱
عقیدۂ توحید اِنسان کو متواضع بناتا ہے	۴۹۲
عقیدۂ توحید یقین و اُمید کا نور پیدا کرتا ہے	۴۹۳
عقیدۂ توحید، پابندِ قانون و اخلاق بناتا ہے	۴۹۴
عقیدۂ توحید اور اجتماعی زندگی	۴۹۵
عقیدۂ توحید امنِ عالم کی ضمانت فراہم کرتا ہے	۴۹۶
عقیدۂ توحید جرأت و شجاعت کا سرچشمہ ہے	۴۹۷
عقیدۂ توحید اور فکر و عمل کی یگانگت	۴۹۸

مشتملات	صفحہ
عقیدۂ توحید انسانی مسائل کا حل	۴۹۸
عقیدۂ توحید اور فلسفہ اخلاق	۴۹۹
❁ مآخذ و مراجع	۵۰۹

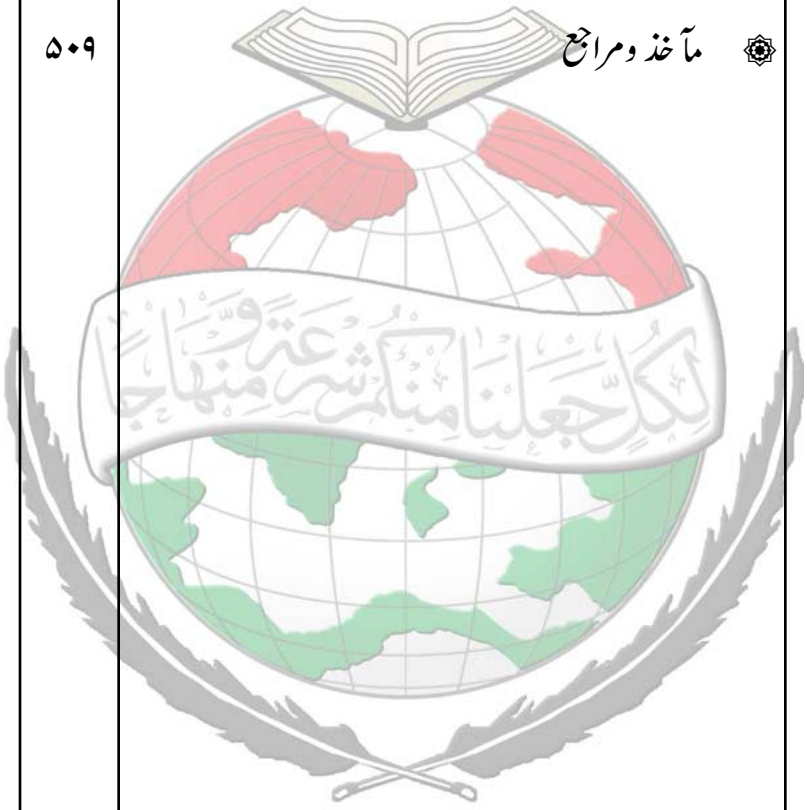

www.MinhajBooks.com

پیش لفظ

قرآنِ حکیم انسانوں کی راہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا وہ دستورِ حیات ہے جس کے قوانین وضوابط مکمل، ہمہ گیر، دائمی اور ابدی ہیں۔ اس صحیفۂ انقلاب کا نزول تاریخِ حیات کا عظیم الشان واقعہ ہے۔ اس لئے کہ یہ وہ سرچشمۂ ہدایت ہے جس سے پوری کائنات ہمیشہ فیض یاب ہوتی رہے گی۔ یہ وہ روشنی ہے جو دلوں کو منور کرتی ہے اور ذہنوں کو روشن۔ یہ صحیفۂ ہدایت ونصیحت بھی ہے اور حکمت وبصیرت کا سرچشمہ بھی۔ اس کے نزول سے وہ تمام تاریکیاں چھٹ گئیں جنہوں نے انسانوں کو نورِ سعادت سے محروم کر رکھا تھا۔ قرآنِ حکیم کے نزول سے روشنی کا ایک تاریخ ساز عہد شروع ہوا۔ اس کے نزول سے بنی نوع انسان کو فکری پستیوں اور اخلاقی کمزوریوں سے نجات پانے کے لئے ایک نسخۂ شفاء دستیاب ہوا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہاں اس صحیفۂ ہدایت کی فضیلت کا ذکر فرمایا ہے وہاں اس کے ادب و احترام اور اس کی تعظیم وتکریم کی پوری پوری تاکید فرمائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی تقدیس وحُرمت کا اگر شعور نہ ہو تو اس کی برکات سے محرومی یقینی ہے۔ ایسے شخص کو نہ ہدایت نصیب ہوسکتی ہے نہ اللہ تعالیٰ کا عرفان نصیب ہو سکتا ہے، نہ مقامِ نبوت و رسالت کا صحیح ادراک ہوسکتا ہے، نہ زندگی کے اُصول اور قوانین اس کی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سرچشمۂ رُشد و ہدایت سے سیراب ہونے کے ساتھ اس کی تکریم کا بھی حکم دیا ہے۔ اس تکریم کے دو پہلو ہیں: ایک ظاہری اور دوسرا باطنی۔ اس کے باطنی احترام کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو مُنزّل من اللہ سمجھا جائے اور اس سے متعلق ہر طرح کے شک اور وسوسے سے اپنے دل کو پاک رکھا جائے۔ یعنی اسے حرف بہ حرف، نقطہ بہ نقطہ وحی الٰہی سمجھا جائے اور اس نسبت کو ملحوظ رکھا جائے جو اُسے رب ذو الجلال سے ہے، جو عظمت و کبریائی اور تقدّس اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہے

وہی صفات اس کے کلام میں بھی ہیں اور حق یہ ہے کہ جس طرح اللہ رب العزت ساری عظمتوں اور حکمتوں کا سر چشمہ ہے اِسی طرح اس کی نازل کی ہوئی یہ کتاب بھی اسی کی نسبت سے اپنے اندر پاکیزگی، تقدّس، حکمت اور عظمت رکھتی ہے۔ لہٰذا قرآنِ حکیم کلامِ الٰہی ہونے کی وجہ سے کلام الملوک، ملوک الکلام کا شاہکار ہے۔ اس کی دوسری نسبت یہ ہے کہ یہ وہ صحیفۂ ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر حضور نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوا۔ جس کی روشنی میں حضور نبی اکرم ﷺ نے نوعِ انسانی کے لئے ایک ابدی اور عالم گیر نظامِ حیات عطا فرمایا۔

قرآنِ حکیم کی تعظیم و تکریم کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ اسے ذوق و شوق سے پڑھا جائے اور سمجھا جائے۔ اسے صرف محرابوں، طاقوں اور الماریوں کی زینت بنا کر نہ رکھا جائے، بلکہ نہایت صحت، خوش الحانی اور ترتیل کے ساتھ اس کی تلاوت بھی کی جائے اور تدبّر سے بھی کام لیا جائے۔ مضامین کے لحاظ سے اپنے دل میں پیدا ہونے والی کیفیات اور تاثرات کا بھی اندازہ کیا جائے۔ اگر ذکرِ عذاب پر خوف طاری نہ ہو، اگر جنت کی بشارت و خوش خبری پر بشاشت پیدا نہ ہو، اگر جہاد کے حکم سے حرارتِ ایمانی پیدا نہ ہو، اور اگر عظمت و کبریائی کے ذکر سے دل مائل بہ سجود نہ ہوں تو اس کی تکریم کا حق ادا نہیں ہوگا۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ میں روح اور قالب کا تعلق ہے۔ قرآن اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور رسولِ اکرم ﷺ اس کتاب کے معلّم ہیں۔ قرآن کلامِ الٰہی ہے اور آپ ﷺ اس کلامِ الٰہی کا مدّعا و مفہوم واضح کرنے والے مُبیّن ہیں۔ قرآنِ حکیم ایک دستور ہے اور آپ ﷺ اس دستور کی مستند اور معتبر تشریح و تفسیر کرنے والے اور شارع ہیں۔ آپ ﷺ کی یہ تمام حیثیات خود قرآن مجید نے متعین کر دی ہیں۔ یہی وہ منصبِ رسالت ہے جس میں اُمت کا کوئی فرد آپ ﷺ کا ہرگز شریک نہیں۔ اس لئے کہ آپ ﷺ کے علاوہ اور دوسرا کوئی شخص صاحبِ وحی نہیں ہے۔

آپ ﷺ نے قرآن حکیم کے بارے میں جو تشریح و تعبیر اور تعلیم و تشریع فرمائی

اس میں کسی خطا کا کوئی امکان نہیں ہے، کیونکہ حضور نبی اکرم ﷺ معصوم عن الخطاء ہیں اور آپ ﷺ کی تشریح وتعبیر بھی قرآنی حکم کی طرح واجب العمل ہے۔ گویا قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ ہدایت کے باب میں یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں قرآن اگر روح ہے تو آپ ﷺ اس کا قالب ہیں، قرآن اگر جان ہے تو حضور نبی اکرم ﷺ اس کا جسم ہیں۔ لہٰذا ہر طرح کی فکری، اعتقادی، جسمانی اور روحانی صحت وسلامتی کی ضمانت اس میں ہے کہ ہم قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ سے رہنمائی حاصل کریں۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے قرآنی اسرار واحکام کی وضاحت فرمائی اور نفس کے اندر چھپی ہوئی برائیوں کو دور کر کے افراد کی تربیت کی، اخلاق وکردار کی تعمیر فرمائی۔

تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ جب تک اُمت قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ کی روشنی سے اکتساب کرتی رہی دنیا اس کے آگے سرنگوں رہی، لیکن بدنصیبی سے اُمت نے قرآن وصاحبِ قرآن ﷺ کا دیا ہوا فکر وعمل کا مثالی نظام چھوڑ دیا۔ اعتقادی سطح پر یہ بگاڑ پیدا ہوا کہ قرآن کو صاحبِ قرآن ﷺ کی سنت کے بغیر سمجھنے کے لئے راہ ہموار کی گئی اور عملی سطح پر گراوٹ یہ ہوئی کہ قرآن کو صحیفۂ انقلاب اور صحیفۂ ہدایت قرار دے کر بحیثیت نظام رہنمائی حاصل کرنے کی بجائے اسے محض برکت وثواب کی کتاب قرار دے دیا گیا۔

اِن دونوں غلط فہمیوں کے ازالہ کے سلسلہ میں شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری مدظلہ العالی کے کارہائے نمایاں تجدیدی شان کے حامل ہیں۔ آپ نے فکر وعمل کی صحت و سلامتی کا جو فکری ڈھانچہ تیار کیا ہے وہ اس امر کا غماز ہے کہ قرآن حکیم کا صحیح فہم صاحبِ قرآن ﷺ کی سنت اور ادب وتعظیم کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا اور اسی طرح قرآن کو صحیفۂ ہدایت وانقلاب قرار دیئے بغیر فرد ومعاشرے کی مشکلات کا حل نہیں نکالا جا سکتا۔

قدرت نے آپ کو فہمِ قرآنی کا ایسا عدیم النظیر اور منفرد اندازِ بیان عطا کر رکھا ہے کہ جس آیت کو جتنی بار بھی موضوعِ سخن بنائیں ہر بار نئے حقائق ومعارف کی دلکش لڑیاں بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ آپ نے تحریکِ منہاج القرآن کی پوری عمارت کو جن پانچ

اساسی و بُنیادی ستونوں پر استوار کیا ہے اُن میں تعلق باللہ اور ربطِ رسالت کے بعد تیسرا اہم ستون رجوع الی القرآن ہے۔ آپ کے نزدیک رجوع الی القرآن کے پانچ تقاضے ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ قرآنِ حکیم سے حُبّی و عشقی تعلق

۲۔ قرآنِ حکیم کی کثرت سے تلاوت

۳۔ قرآنِ حکیم کو تدبُّر و تفکر کے ساتھ پڑھا جائے

۴۔ قرآنی تعلیمات پر خود بھی عمل کیا جائے اور دوسروں کو بھی اِس کی دعوت دی جائے۔

۵۔ قرآنی تعلیمات کو عام کرنے میں اپنی تمام تر صلاحیتیں صَرف کی جائیں۔

زیرِ نظر کتاب - معارِفِ آیۃ الکرسی - اِس امر کی شہادت فراہم کرتی ہے کہ مذکورہ بالا تقاضوں کو اگر من میں اُتار کر قرآنِ کریم سے اکتساب و اخذِ فیض کیا جائے تو آیت الکرسی ہی ہمیں زندگی کے تمام شعبہ جات کے لئے مستقل رہنما اُصول فراہم کرتی ہے۔ بشرطیکہ تدبُّر و تفکر کرنے والا بھی بزمِ عشق و مستی کا پروردہ شیخ الاسلام پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری مدظلہ العالی ہو۔ زیرِ نظر کتاب آپ کے دروس و خطابات کو پیشِ نظر رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔

آیۃ الکرسی کو اعظم الآیات کہا گیا ہے۔ اِس میں جن صفاتِ خداوندی کو بیان کیا گیا ہے اِن میں سے ہر ایک اِسلامی نظامِ حیات کے اساسی اُصولوں میں سے کسی ایک اُصول پر مشتمل ہے۔ اسلام کا اساسی اور بنیادی عقیدہ ''عقیدۂ توحید'' ہے اور یہ اسلامی نظامِ زندگی کی شہ رگ ہے، جب تک یہ اساس ٹھیک نہ ہو نظامِ زندگی کو سمجھا نہیں جا سکتا اور نہ ہی اس کے بغیر دیگر عقائدِ اسلامی کی صحیح تشریح ہو سکتی ہے اور نہ یہ نظام نفسِ انسانی کے مسلمہ حقائق سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے اور نہ اس کی کوئی معقول اور پُر از یقین تعبیر کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا عقیدۂ توحید اِسلامی تصورات و عقائد کی اساس ہے جس سے اِسلامی نظامِ

زندگی اپنی مفصل صورت میں متشکل ہوتا ہے۔

آیۃ الکرسی میں ذات واجب الوجود کے بارے میں انسانی ضمیر کی تطہیر کی گئی ہے اور اِنسانی ضمیر جاہلیت کی تہہ در تہہ غلط افکار کے نیچے دبا ہوا تھا اور انسانی ذہن میں تصورِ الٰہ اپنی صاف و شفاف اور واضح شکل میں نہ تھا۔ یہ عقیدہ خرافات اور دیو مالائی عقائد میں لپٹا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے فلاسفر کے ہاں بھی تصورِ الٰہ واضح اور صاف نہ تھا۔ لہٰذا آیت الکرسی میں جہاں قدیم تصورات کی تصحیح کی گئی ہے وہاں عقیدہ توحید کے نام پر انبیاء و اولیاء کی تنقیص کا پہلو جو خود تراشیدہ ہے اس کی بھی خوب بیخ کُنی کی گئی ہے۔ اس میں مقامِ اُلوہیت اور مقامِ عبدیت کی اچھی طرح وضاحت کی گئی ہے، اُلوہیت اور عبدیت کے تمام تر تقاضوں اور حدود و شرائط کو تفصیلاً اُجاگر کیا گیا ہے۔ اِس ضمن میں وہ تمام باطل عقائد و نظریات واضح ہو جاتے ہیں جو عقیدۂ توحید کی آڑ میں پھیلائے گئے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری مدظلہ العالی نے آیۃ الکرسی کے دروس میں حقیقتِ الٰہیہ اور حقیقتِ عبدیت کے درمیان التباس پیدا کرنے والے ہر ایک پہلو کی پوری تفصیل بیان کی ہے۔ صفاتِ خداوندی کے ضمن میں قدیم و جدید گمراہیوں کا جہاں ازالہ کیا ہے، وہاں عقیدۂ شفاعت اور عقیدۂ علم غیب کے بارے میں بھی پھیلائے گئے غلط عقائد کا محققانہ محاکمہ کیا ہے۔ آیۃ الکرسی پر یہ دروس عقیدہ و عمل کی اصلاح کا حسین سنگم ہیں۔ یہ حضرت شیخ الاسلام مدظلہ العالی کے آیۃ الکرسی پر نہایت محققانہ دروس ہیں۔ عقیدہ و عمل کی تطہیر کا ہر ایک پہلو پُوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اِن میں آپ کی دقتِ نظر، وسعتِ مطالعہ اور مجتہدانہ طرزِ احساس کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے ساتھ آپ کے دل نشین اُسلوبِ کلام، منطقی طرزِ استدلال اور جوشِ بیاں کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آپ نے آیۃ الکرسی کے دروس میں عقیدہ و عمل کے ہر پہلو پر نہایت متوازن بحث کی ہے اور ہر طرح کی افراط و تفریط کو بیان کر کے اسلام کی شاہراہِ مستقیم و متوازن کو واضح انداز میں اُجاگر کیا ہے۔ آپ کے یہ دروس تفسیری ادب میں اپنے اُسلوبِ کلام، اندازِ بیان اور

اپنی صورتِ فکر کے لحاظ سے ایک منفرد مقام کے حامل ہیں۔ مزید برآں آپ کا اندازِ بیان اتنا مسحور کُن ہے کہ قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔

حضرت شیخ الاسلام مدظلہ العالی کے ان علمی، عرفانی اور اعتقادی افکار سے معمور و لبریز دروس کو اَحقر خاکسار نے ضروری حشو و زوائد کے ساتھ مرتب کیا ہے، ترتیب و تدوین میں اِس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ مضامین، عنوانات اور عبارت میں تفسیری آہنگ موجود رہے۔ تاہم بعض نازک اور اہم مقامات پر ناکارہ مرتب نے کتبِ تفاسیر و عقائد کی روشنی میں حتی المقدور وضاحت کی ہے۔ اس لئے اگر اس کاوش میں کوئی جھول اور کمی دیکھیں تو اس کی ذمہ داری عاجز خاکسار پر ہے۔ اغلاط مرتب ہی کی کوتاہی سمجھیں۔ اہلِ علم سے گذارش ہے کہ ہمیں ان سے مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ تصحیح کی جا سکے۔ نیز اَحقر خاکسار آپ کے تفسیری معارِف پر کام کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کے اِجتہادی تفرّدات، مجالسِ شیخ الاسلام اور حضرت فرید ملّتؒ کے علمی کارناموں پر بھی کام کر رہا ہے۔ قارئین کی مفید تجاویز کا اِنتظار رہے گا تاکہ مذکورہ تحقیقی اُمور میں رہنمائی حاصل کی جا سکے۔

اِن دروس کو مرتب و مدون کرنے میں ڈاکٹر علی اکبر قادری الازہری، ڈاکٹر طاہر حمید تنولی، ڈاکٹر رحیق احمد عباسی، علامہ محمد فاروق رانا اور اجمل علی مجددی کی خصوصی معاونت بھی مختلف مراحل میں شامل رہی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بصدقۂ حضور نبی آخر الزماں ﷺ ہمیں قرآنی حقائق کو سمجھنے اور اِن پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(آمین بجاہ سیّد المرسلین ﷺ)

www.MinhajBooks.com

محمد عمر حیات الحسینی

۲ اگست، ۲۰۰۷ء

﴿آیۃ الکرسی﴾

اَللّٰهُ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ○ (۱)

’’اللہ، کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے (سارے عالم کو اپنی تدبیر سے) قائم رکھنے والا ہے، نہ اس کو اُونگھ آتی ہے اور نہ نیند، جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اِسی کا ہے، کون ایسا شخص ہے جو اِس کے حضور اِس کے اذن کے بغیر سفارش کر سکے، جو کچھ مخلوقات کے سامنے (ہو رہا ہے یا ہو چکا) ہے اور جو کچھ اِن کے بعد (ہونے والا) ہے (وہ) سب جانتا ہے اور وہ اُس کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جس قدر وہ چاہے اور اُس کی کرسی (سلطنت و حکومت) تمام آسمانوں اور زمین کو محیط ہے اور اِس پر ان دونوں (یعنی زمین و آسمان) کی حفاظت ہرگز دشوار نہیں، وہی سب سے بلند رُتبہ بڑی عظمت والا ہے○‘‘

(۱) البقرۃ، ۲:۲۵۵

مفردات اور جملوں کی تشریح

اللّٰہ لا الٰہ الا ھو: اللہ ذات واجب الوجود کا اِسم ذاتی ہے۔ **لا** نفی جنس **الٰہ** معبود۔ **الّا** کلمہ استثناء **ھو** ضمیر واحد مذکر غائب یعنی اللہ وہ ہے کہ کوئی معبود نہیں مگر صرف وہ۔

الحيّ: حيّ اصل میں حیوٌ تھا۔ واو ی ہو کر ی میں مدغم ہو گیا۔ یہ حیات سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں زندگی، **الحيّ** زندہ کامل حیات کا مالک جس پر کبھی فنا طاری نہ ہو سکے۔ کمالِ وجود یہ میں سب سے پہلا کمال حیات ہے۔ حیّ لغت میں اس زندہ شے کو کہتے ہیں جو واقف ہو، سنتا ہو، دیکھتا ہو اور قادر ہو۔ پس صفتِ حیات تمام صفاتِ کمال کا مبداء ہے۔

القیوم: قیام سے مبالغہ کا صیغہ ہے، **القائم بذاتہٖ والمقوم لغیرہ**، قیوم وہ جو نہ صرف اپنی ذات سے قائم ہو بلکہ دوسروں کے بھی قیام کا سبب ہو۔

حيّ سے اللہ تعالیٰ کا واجب الوجود ہونا بیان کیا اور قیّوم سے اللہ تعالیٰ کا واہب الوجود ہونا بیان کیا۔ یقیناً وہ بذاتہ اور بنفسہ واجب الوجود ہے اور دوسروں کو حیات ہبہ اور عطا کرنے والا ہے۔ ممکن میں جو وجود بھی ہے وہ اُسی واجب الوجود کا ہبہ اور عطیہ ہے۔ پس صفتِ حیات کو ذکر کر کے کمالِ وجود کو بیان کیا اور صفتِ قیومت کو ذکر کر کے کمالِ ایجاد کو بیان فرمایا۔

لا تاخذہٗ سنۃ ولا نوم: لا تاخذہ، أخذ یأخذ أخذًا سے فعل نہی واحد مؤنث غائب۔ سنۃ اُونگھ اس کا مادہ ''وسن'' ہے یعنی غفلت اور خواب، نوم، نام ینام نوما سے ہے۔ نہ اُس پر اونگھ طاری ہوتی ہے اور نہ نیند وہ ہر وقت باخبر اور مستعد ہے۔ نیند کی ابتداء اور انتہاء دونوں کی نفی کی گئی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ غفلت اور لاپرواہی کے اثرات سے پاک ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا تغیرات، حوادث اور

ممکنات کے خصائص سے پاک اور بری ہونا بیان کیا گیا ہے۔ یہ جملہ ''الحي القيوم'' کی تاکید ہے۔

له ما فی السموت وما فی الارض: لهٗ میں لام تملیک کے لئے ہے۔ لهٗ کے مقدم لانے سے حصر کے معنی پیدا ہوئے ہیں یعنی زمین و آسمان میں جو کچھ ہے صرف اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے کسی اور کا کوئی حق نہیں۔

من ذا الّذی یشفع عنده الّا باذنه: من استفهامیه ذا اِسم اشاره۔ الذی موصول، یشفع، شفع یشفع شفعا. صیغه واحد مذکر غائب۔ ایک شے کو اُس جیسی دوسری چیز سے ملانا۔ شفاعت کے لئے اذنِ الٰہی کی قید ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کسی کو شفاعت کا حق حاصل نہیں۔ یہ بات اُس کے مختارِ مطلق ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

یعلم ما بین أیدیهم و ما خلفهم: علم، یعلم مضارع واحد مذکر غائب، ما موصوله. بین ایدیهم. اُن کے ہاتھوں کے درمیان اُن کے سامنے وما خلفهم۔ خلفت پیچھے اور جو اُن کے پیچھے ہے۔ أیدیهم وخلفهم میں ضمیر جمع یا من ذا کے مدلول کی طرف ہے جس میں ملائکہ اور رُسل داخل ہیں یا فی السموات والارض کی جانب ہے اور ضمیر مذکر اِس لئے کہ اِس سے زمین و آسمان میں اہلِ عقول مراد ہیں یعنی جو کچھ اُن کے سامنے اور جو کچھ اُن کے پیچھے ہے یعنی وہ تمام کائنات کے اوّل و آخر کا کامل علم رکھتا ہے۔

ولا یحیطون بشیءٍ من علمهٖ اِلّا بما شآء: لا یحیطون. اَحاطَ یحیط اِحاطةً فعل نہی جمع مذکر غائب۔ اِلّا کلمہ استثناء ہے۔ بما شآء جو کچھ وہ چاہے ما موصول ہے۔ شاءَ ماضی واحد مذکر غائب۔

وسع کرسیه السموت والارض: وسع (وسع یسع وسعاً) ماضی واحد

مذکر غائب۔ سماء کی جمع سَمٰوٰت، آسمانوں۔ والارض زمین مؤنث سماعی۔

ولا یودہٗ حفظھما: ولا یودہٗ (اٰد، یود اَوْدًا) واحد مذکر غائب اِس کا مادہ اَوْدُ ہے۔ جس کے لغوی معنی جہد و مشقت کے ہیں۔ حِفظھما سے مراد اُن دونوں کی حفاظت یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات پر آسمانوں اور زمین کی دیکھ بھال گراں نہیں ہے۔ اس کو کسی کی مدد اور سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔

وَھُوالعِلِیُّ العَظِیم: یہ دونوں اِسمِ صفت ہیں۔ العلی کا مادہ عُلوُ ہے اور عظیم کا مادہ ع. ظ. م ہے۔

www.MinhajBooks.com

آیت الکرسی کے فضائل

مفسرین نے احادیث و روایات کی روشنی میں قرآنِ حکیم کی بعض آیات کے فضائل بیان کئے ہیں۔ قرآنی آیات میں آیت الکرسی کے فضائل جس کثرت سے منقول ہوئے ہیں۔ قرآن حکیم کی کوئی اور آیت اِس معاملہ میں اِس کی مثل نہیں ہے۔

سورتوں کے فضائل کے بارے میں ایک غلط فہمی کا ازالہ

ایک آیت کا دوسری سورت یا آیت سے افضل و اعلیٰ ہونا اور عظیم تر ہونا کثرتِ اجر و ثواب کی بناء پر ہوتا ہے۔ یہ علمی اُصول ذہن نشین کرلیا جائے کہ جب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ سورۂ یٰسین قرآنِ حکیم کا دل ہے اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کا اجر و ثواب قرآنِ حکیم کی دو تہائی تلاوت کے برابر ہے۔ سورۂ اخلاص کا ایک بار پڑھنا قرآنِ حکیم کے ایک تہائی حصہ کے اجر و ثواب کے برابر ہے۔ یا یہ بیان کیا جاتا ہے کہ فلاں سورت پورے قرآن حکیم میں افضل ہے یا فلاں آیت پورے قرآن حکیم کی آیتوں میں افضل و اعلیٰ ہے۔ اِن باہمی فضیلتوں کے بیان کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) دوسری آیات یا سورتیں کم تر ہیں بلکہ اُس آیت یا سورہ کے خصوصی اجر و ثواب کے لحاظ سے نمایاں فضیلت کا اظہار کرنا مقصود ہوتا ہے کہ فلاں آیت یا سورہ کثرتِ ثواب و اجر میں بہت بلند و بالا ہے۔ چنانچہ اب آیت الکرسی کے چند فضائل ذکر کئے جاتے ہیں۔

۱۔ امام ابن حبان اور امام نسائی حضرت ابی امامہؓ سے روایت کرتے ہیں:

مَن قرأ آية الكرسي دبر كل صلوة مكتوبة لم يمنعه من دخول الجنّة اِلاَّ أن يموت. (۱)

(۱) ۱۔ نسائي، السنن الكبرىٰ، ۶: ۳۰، رقم: ۹۹۲۸

۲۔ طبراني، المعجم الأوسط، ۸: ۹۳، رقم: ۸۰۶۸

۳۔ بيهقي، شعب الإيمان، ۲: ۴۵۸، رقم: ۲۳۹۵

’’جس شخص نے ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھی اِسے جنت میں جانے سے موت کے سواء کوئی اور چیز روکنے والی نہیں۔‘‘

۲۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے فیض یافتہ عظیم صحابی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

عَن اُبی بن کعبٍ قال: قال رسول اللہ ﷺ: یا أبا المنذرأَتدری أَیُّ اٰیةٍ من کتاب اللہ معک أعظم؟ قال: قلتُ: اللہ ورسولہ أعلمُ. قال: یا أبا المنذِر، أتدری أَیُّ آیة من کتاب اللہ معک أعظمُ، قلتُ: اللہ لا إلٰہ إلّا ھو الحيّ القیوم. قال: فضرب فی صدری وقال: واللہ لیھنک العلمُ یا أبا المنذر.(۱)

’’حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور ﷺ نے فرمایا: اے ابو منذر! تم جانتے ہو کتاب اللہ کی سب سے عظیم آیت کون سی ہے۔ اُنہوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ پھر حضور نبی اکرم ﷺ نے پوچھا: تمہارے ساتھ کتاب اللہ کی کون سی آیت سب سے عظیم ہے اُنہوں نے کہا۔ ’’اللہ لا إلٰہ إلّا ھو الحیّ القیوم۔‘‘ حضرت ابی بن کعب بیان کرتے ہیں: اس کے بعد حضور نبی اکرم ﷺ نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: تمہیں یہ علم مبارک ہو۔‘‘

ابو منذر حضرت ابی بن کعب کی کنیت ہے۔ حضرت اُبی حضور نبی اکرم ﷺ کے اُن اُولوالعزم صحابہ میں سے تھے جو قرآن حکیم کے سب سے زیادہ جاننے والے اور قرآن

(۱) ۱۔ مسلم، الصحیح، کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا، باب فضل سورۃ الکھف وآیۃ الکرسی، ۱: ۵۵۶، رقم: ۸۱۰

۲۔ أبو داؤد، السنن، کتاب الصلاۃ، باب ما جاء في آیۃ الکرسی، ۲: ۷۲، رقم: ۱۴۶۰

۳۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۵: ۱۴۱، رقم: ۲۱۳۱۵

حکیم کے بہت بڑے عالم تھے اور صحابہ کرام ﷺ میں عظیم مفسر قرآن مشہور تھے۔

تعلیمِ نبوی ﷺ کا منہاج

یہ سوال کرنا حضور نبی اکرم ﷺ کے طریقِ تعلیم میں سے ایک طریقہ ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ صحابہ کرام ﷺ سے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کو اور قرآن حکیم کو کتنا کچھ سمجھا ہے۔ بعض اوقات خاص خاص سوالات کیا کرتے تھے۔ صحابہ کرام ﷺ کا یہ طریقہ تھا کہ حضور نبی اکرم ﷺ کے سوال پر اس اُمید میں کہ کچھ مزید معلومات حاصل ہوں، وہ اپنے علم کے مطابق جواب دینے کے بجائے یہ عرض کیا کرتے تھے کہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کو زیادہ معلوم ہے۔ تاکہ رسول اللہ ﷺ وہ بات خود بتائیں۔ رسول اللہ ﷺ کا سوال کرنے سے یہ ارادہ بھی ہوتا تھا کہ صحابہ ﷺ کو مزید علم سکھائیں۔ پس صحابہ ﷺ کے یہ عرض کرنے پر کہ اللہ و رسولہٗ اعلم۔ آپ ﷺ اپنے سوال کا خود جواب دے دیا کرتے تھے اور اگر آپ ﷺ کا ارادہ اُن کی معلومات کو جاننے ہی کا ہوتا تو آپ ﷺ اپنے سوال کو پھر دہراتے تھے تاکہ صحابہ ﷺ اپنی طرف سے جواب دیں۔ یہاں پر بھی یہی صورت پیش آئی۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے حضرت اُبی ﷺ بن کعب سے پہلی دفعہ سوال کیا تو اُنہوں نے جواب میں عرض کیا کہ اللہ اور اُس کے رسول کو زیادہ معلوم ہے۔ مگر چونکہ حضور نبی اکرم ﷺ کے پیشِ نظر یہ معلوم کرنا تھا کہ ابی بن کعب ﷺ کے فہم میں قرآن حکیم کی سب سے زیادہ وزنی آیت کون سی ہے؟ اس لیے آپ ﷺ نے دوبارہ وہی سوال کیا۔ اس پر اُنہوں نے عرض کیا کہ سب سے بڑی آیت آیت الکرسی ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے ان کے اس جواب کی تائید فرمائی۔

آیت الکرسی کی یہ عظمت و اہمیت اس وجہ سے ہے کہ یہ قرآن حکیم کی ان چند آیتوں میں سے ہے جن میں توحید کی مفصل تعلیمات بیان ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا جامع بیان ہوا ہے۔ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا صحیح تصور ذہن نشین کرنے کے لیے آیا ہے۔ اگر انسان کو اللہ تعالیٰ کا صحیح تصور حاصل نہ ہو تو باقی ساری تعلیم بے معنی ہو جاتی

ہے۔ عقیدہ توحید آدمی کی سمجھ میں آجانے کا مطلب یہ ہے کہ دین کی بنیاد قائم ہوگئی۔ اس بناء پر قرآن حکیم کی سب سے بڑی آیت وہ ہے جس میں توحید کے مضمون کو بہترین طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔

۳۔ امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

عن أنس رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: من قرأ فی دبر کل صلوۃ مکتوبہ آیۃ الکرسی حفظ الی الصلوۃ الاخر ولا یحافظ علیھا الا نبی أو صدیق أو شھید. (۱)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی کو پڑھا، اللہ تعالیٰ اس کو دوسری نماز تک اپنی حفاظت میں رکھتا ہے اور آیت الکرسی کی حفاظت صرف نبی، صدیق یا شہید ہی کرتا ہے۔''

اس سے ثابت ہوا کہ فرض نمازوں کے بعد آیت الکرسی کا پڑھنا نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کی سنت پر عمل کرنا ہے۔

شیطان اور جن کا چوری کرنا

۴. **عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: وَكَّلَنِي رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بِحِفْظِ زَكَاةِ رَمَضَانَ فَأَتَانِي آتٍ فَجَعَلَ يَحْثُو مِنَ الطَّعَامِ فَأَخَذْتُهُ وَقُلْتُ وَاللهِ لَأَرْفَعَنَّكَ إِلَى رَسُولِ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ: إِنِّي مُحْتَاجٌ وَعَلَيَّ عِيَالٌ وَلِي حَاجَةٌ شَدِيدَةٌ قَالَ فَخَلَّيْتُ عَنْهُ فَأَصْبَحْتُ فَقَالَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: يَا أَبَا هُرَيْرَةَ مَا فَعَلَ أَسِيرُكَ الْبَارِحَةَ قَالَ: قُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ شَكَا حَاجَةً**

(۱) بیهقي، شعب الایمان، ۲: ۴۵۹، رقم: ۲۳۹۶

شَدِيدَةً وَعِيَالًا فَرَحِمْتُهُ فَخَلَّيْتُ سَبِيلَهُ قَالَ أَمَا إِنَّهُ قَدْ كَذَبَكَ وَسَيَعُودُ فَعَرَفْتُ أَنَّهُ سَيَعُودُ لِقَوْلِ رَسُولِ اللهِ ﷺ إِنَّهُ سَيَعُودُ فَرَصَدْتُهُ فَجَاءَ يَحْثُو مِنَ الطَّعَامِ فَأَخَذْتُهُ فَقُلْتُ لَأَرْفَعَنَّكَ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ قَالَ: دَعْنِي فَإِنِّي مُحْتَاجٌ وَعَلَيَّ عِيَالٌ لَا أَعُودُ فَرَحِمْتُهُ فَخَلَّيْتُ سَبِيلَهُ فَأَصْبَحْتُ فَقَالَ لِي رَسُولُ اللهِ ﷺ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ مَا فَعَلَ أَسِيرُكَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ شَكَا حَاجَةً شَدِيدَةً وَعِيَالًا فَرَحِمْتُهُ فَخَلَّيْتُ سَبِيلَهُ قَالَ أَمَا إِنَّهُ قَدْ كَذَبَكَ وَسَيَعُودُ فَرَصَدْتُهُ الثَّالِثَةَ فَجَاءَ يَحْثُو مِنَ الطَّعَامِ فَأَخَذْتُهُ فَقُلْتُ لَأَرْفَعَنَّكَ إِلَى رَسُولِ اللهِ وَهَذَا آخِرُ ثَلَاثِ مَرَّاتٍ أَنَّكَ تَزْعُمُ لَا تَعُودُ ثُمَّ تَعُودُ قَالَ دَعْنِي أُعَلِّمْكَ كَلِمَاتٍ يَنْفَعُكَ اللهُ بِهَا قُلْتُ مَا هُوَ قَالَ إِذَا أَوَيْتَ إِلَى فِرَاشِكَ فَاقْرَهْ آيَةَ الْكُرْسِيِّ ﴿اللهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ﴾ حَتَّى تَخْتِمَ الْآيَةَ فَإِنَّكَ لَنْ يَزَالَ عَلَيْكَ مِنَ اللهِ حَافِظٌ وَلَا يَقْرَبَنَّكَ شَيْطَانٌ حَتَّى تُصْبِحَ فَخَلَّيْتُ سَبِيلَهُ فَأَصْبَحْتُ فَقَالَ لِي رَسُولُ اللهِ ﷺ مَا فَعَلَ أَسِيرُكَ الْبَارِحَةَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ زَعَمَ أَنَّهُ يُعَلِّمُنِي كَلِمَاتٍ يَنْفَعُنِي اللهُ بِهَا فَخَلَّيْتُ سَبِيلَهُ قَالَ مَا هِيَ قُلْتُ قَالَ لِي إِذَا أَوَيْتَ إِلَى فِرَاشِكَ فَاقْرَهْ آيَةَ الْكُرْسِيِّ مِنْ أَوَّلِهَا حَتَّى تَخْتِمَ الْآيَةَ ﴿اللهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ﴾ وَقَالَ لِي لَنْ يَزَالَ عَلَيْكَ مِنَ اللهِ حَافِظٌ وَلَا يَقْرَبَكَ شَيْطَانٌ حَتَّى تُصْبِحَ وَكَانُوا أَحْرَصَ شَيْءٍ عَلَى الْخَيْرِ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ أَمَا إِنَّهُ قَدْ صَدَقَكَ وَهُوَ كَذُوبٌ تَعْلَمُ مَنْ تُخَاطِبُ مُنْذُ ثَلَاثِ لَيَالٍ يَا أَبَا

هُرَيْرَةَ قَالَ لَا قَالَ ذَاکَ شَيْطَانٌ.(۱)

’’حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں رمضان المبارک میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صدقۂ فطر کی نگرانی کے لئے مجھے مقرر کیا۔ میرے پاس ایک آنے والا آیا اور غلہ کو سمیٹنے لگا۔ میں نے اسے پکڑ کر کہا: میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کروں گا۔ اس نے کہا میں ایک غریب آدمی ہوں اور میرے ذمہ اہل و عیال ہیں اور میں بڑا ضرورتمند ہوں۔حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے ترس کھا کر اسے چھوڑ دیا۔ صبح کے وقت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا میرے کچھ عرض کرنے سے پہلے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ابو ہریرہ گذشتہ رات تمہارے قیدی نے کیا کیا۔ میں نے عرض کیا: حضور اہل و عیال اور اپنی سخت محتاجی کی اس نے شکایت کی تو مجھے اس پر ترس آ گیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سنو! اس نے تم سے غلط کہا ہے۔ پھر وہ جلد ہی آئے گا۔ یہ کہتے ہیں مجھے تو یقین ہو گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمانے کے باعث وہ ضرور آئے گا چنانچہ میں اِس کے انتظار میں بیٹھا ہی تھا کہ وہ آیا اور غلہ اُٹھانے لگا۔ میں نے اسے پکڑ کر کہا اب تو میں تمہیں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ضرور پیش کروں گا۔اس نے کہا: مجھے چھوڑ دیجئے میں ایک محتاج آدمی ہوں اور میرے ذمے اہل و عیال ہیں اب پھر میں نہیں آؤں گا۔ مجھے ترس آیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا اور صبح کے وقت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا ۔حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: ابوہریرہ! رات تمہارے قیدی نے کیا کیا۔ میں

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الوکالۃ، باب وکالۃ المرأۃ الإمام في النکاح، ۲: ۸۱۲، رقم: ۲۱۸۷

۲۔ ابن خزیمۃ، الصحیح، ۴: ۹۱، رقم: ۲۴۲۴

۳۔ نسائی، السنن الکبریٰ، ۶: ۲۳۸، رقم: ۱۰۷۹۵

نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس نے اہل و عیال اور شدید احتیاج کی شکایت کی پھر میں نے ترس کھا کر اِسے چھوڑ دیا۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: سنو! اِس نے تم سے غلط کہا ہے پھر وہ جلد ہی آئے گا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ کے فرمانے کے باعث وہ ضرور آئے گا چنانچہ میں اِس کے انتظار ہی میں بیٹھا تھا کہ وہ آیا اور غلہ اُٹھانے لگا۔ میں نے اسے گرفتار کر کے کہا میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ضرور پیش کروں گا۔ یہ تیسری بار ہے کہ تم کہتے ہو کہ نہیں آؤ گے پھر آتے ہو۔ اس (شیطان) نے کہا میں آپ کو چند کلمے بتا دیتا ہوں جس کے ذریعہ آپ کو اللہ تعالیٰ فائدہ پہنچائے گا۔ جب آپ سونے کے لئے بستر پر جائیں تو آیت الکرسی ''**اللہ لا الہ الّا ھو الحي القیوم**'' آخر آیت تک پڑھ لیں۔ ایسا کریں گے تو اللہ کی طرف سے مستقل آپ کے اوپر ایک محافظ رہے گا اور شیطان آپ کے قریب نہیں آئے گا اسی حال میں آپ کی صبح ہوگی۔ جب اس نے یہ وظیفہ بتایا تو میں نے پھر اسے چھوڑ دیا۔ صبح کو حضور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے قیدی نے کیا کیا۔ میں نے عرض کیا: اس نے مجھے چند ایسے کلمات بتانے کو کہا جن سے اللہ تعالیٰ مجھے نفع دے گا۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: سنو! اس نے تم سے سچ کہا حالانکہ وہ بہت بڑا جھوٹا ہے۔ ابو ہریرہ! تین راتوں سے جس سے تم ہم کلام ہو رہے ہو تم جانتے بھی ہو وہ کون ہے، میں نے عرض کیا: نہیں یا رسول اللہ۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا وہ شیطان ہے۔

www.MinhajBooks.com

فوائد حدیث

اس حدیث مبارکہ سے حسب ذیل نکات اور فوائد محدثین نے مستنبط کئے ہیں۔

زکوٰۃ رمضان سے مراد کھانے پینے کا وہ سامان، غلہ اور ایسی چیزیں ہیں جو حضور

نبی اکرم ﷺ رمضان کے زمانے میں تقسیم کی خاطر رکھتے تھے۔ دن کے وقت تقسیم سے جو بچ جاتا رات کو اس کی حفاظت کی ضرورت پیش آتی۔ ایک دفعہ جب ابو ہریرہؓ اس سامان کی حفاظت پر مقرر تھے تو یہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ اس طرح کے واقعات میں سے ہے جن کے بارے میں انسان کوئی توجیہ نہیں کر سکتا کہ ایسا کیونکر ہوا۔ بہرحال اس طرح کی صورتیں بعض اوقات انسانوں کے ساتھ پیش ضرور آتی ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی یہ مشکل پیش آئی۔ یہ حدیث فضائل القرآن کے باب میں اس وجہ سے نقل کی گئی ہے کہ شیطان خود اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اُس شخص پر اِس کا کوئی بس نہیں چلتا جو رات کو آیت الکرسی پڑھ کر سوتا ہے۔ قرآن حکیم میں چند مقامات ایسے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کی توحید کا مضمون جامع انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک مقام یہ آیت الکرسی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس آدمی کے دل و دماغ میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا تصور رچ بس گیا ہو اس پر شیطان کا بس کہاں چل سکتا ہے۔ شیطان تو اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔ آیت الکرسی کے کلمات بذاتِ خود بابرکت ہیں، لیکن اگر پڑھنے والا سمجھ بھی رہا ہو کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے۔ یہ نور علیٰ نور والی بات ہے۔

۱۔ انسان شیطان کو دیکھ سکتا ہے ہاں اس کی اصلی شکل میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ. (۱)

’’بیشک وہ (خود) اور اس کا قبیلہ تمہیں (ایسی ایسی جگہوں سے) دیکھتا (رہتا) ہے جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔‘‘

۲۔ علامہ طیبی لکھتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے غیب کی خبر دی ہے اس لئے تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے کچھ بیان کرنے سے پہلے حضور نبی اکرم ﷺ نے پوچھا تمہارے قیدی نے کیا کیا اور یہ بھی فرمایا کہ وہ دوبارہ سہ بارہ آئے گا اور وہ دوسری، تیسری شب

(۱) الاعراف، ۷: ۲۷

بھی آیا۔[1]

۳۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس سے کرامت وعظمت بھی ثابت ہوئی کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت اور اطاعت کی برکت سے شیطان کو پکڑا اور اسے نامراد واپس کیا۔

۴۔ فقہائے کرام لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اس شخص سے بھی علم حاصل کرنا درست ہے جو اپنے کہے پر خود عمل نہ کرے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ علم حاصل کرنے والا حاصل کئے جانے والے علم کی بہتری سے واقف ہو۔ ایسا نہ ہو کہ علم کی اچھائی اور خرابی کا اعتبار نہ رکھتا ہو ورنہ اس صورت میں جائز نہ ہوگا۔[2]

۵۔ سوتے وقت اگر کوئی آیت الکرسی پڑھ لے تو رات بھر اللہ تعالیٰ کا ایک نگہبان اس کی حفاظت کرتا ہے اور اس سے شیطان قریب نہیں آسکتا۔ امام بیہقی کی روایت ہے کہ جو شخص سوتے وقت آیت الکرسی پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اس کے گھر اور اس کے پڑوسی کے گھر اور اس کے آس پاس کے اہل خانہ سب کو امن و عافیت دیتا ہے۔

عن أيوب الأنصاری رضی اللہ عنہ قال: كان لي نخل في سهوةٍ لی فجلعت أراه ينقص منه فذكرت ذلک للنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقال: إنّک ستجد فيه غداً هرة فقل: أجيبی رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فلمّا كان الغد وجدت فيه هرة فقلت: أجيبی رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فتحولت عجوزاً وقالت: أذكرک الله لما تركتنی فإنّي غير عائدة فتركتها، فأتيت النبي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقال: ما فعل الرجل وأسيره؟ فأخبرته خبرها فقال كذبت هی عائدة فقل لها أجيبی رسول الله فتحولت عجوزاً فقالت: أذكرک الله يا أبا أيوب لما تركتنی هذه المرة فإنّی غير

(۱) ملا علی قاری، مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، ۲: ۵۸۲

(۲) ملا علی قاری، مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، ۲: ۵۸۳

عائدة فترکتها، ثم أتیت رسول الله ﷺ فقال لی کما قال لی، فقلت ذلک ثلاث مرات فقالت لي في الثالثة: أذکرک الله یا أبا أیوب لما ترکتنی حتّی أعلمک شیئا لا یسمعه شیطان فیدخل ذلک البیت، فقلت: ما هو؟ فقالت: آیة الکرسی، لا یسمعها شیطان إلّا ذهب، فذکرت ذلک للنبي ﷺ فقال: صدقت إن کانت کذوبا.[۱]

’’حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ان کی ایک پوٹلی تھی اس میں کھجوریں رکھی ہوئی تھیں جن آتے تھے اور اس سے کھجور لے جاتے تھے۔ انہوں نے حضور نبی اکرم ﷺ سے اس کی شکایت کی حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جاؤ جب تمہیں وہ نظر آئیں تو یہ کہنا۔ أجیبی رسول الله ’’تم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤ۔‘‘ چنانچہ انہوں نے جب یہ کلمات کہے ان کی برکت سے جن کو پکڑ لیا تو اس جن نے قسم کھائی کہ پھر وہ نہیں آئے گا۔ اُنہوں نے اسے چھوڑ دیا اور حضور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے دریافت فرمایا: تمہارے قیدی کا کیا معاملہ رہا۔ اُنہوں نے کہا اس نے قسم کھائی کہ پھر نہیں آئے گا۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اس نے جھوٹ کہا وہ جھوٹ کا عادی ہے پھر اُنہوں نے دوبارہ گرفتار کیا، اس نے باز آنے کی قسم کھائی پھر اُنہوں نے چھوڑ دیا اور حضور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے قیدی کا کیا ہوا انہوں نے کہا اس نے اس حرکت سے باز آنے کی قسم کھائی (اس لئے اسے چھوڑ دیا) حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اس نے جھوٹ کہا، جھوٹ کا یہ عادی ہے پھر اُنہوں نے اسے گرفتار کرکے کہا اب میں تمہیں نہ چھوڑوں گا اور تمہیں

(۱) طبرانی، المعجم الکبیر، ۴: ۱۶۲، رقم: ۴۰۱۲

حضور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں لے کر جاؤں گا اس جن نے کہا میں تمہیں ایک چیز بتاتا ہوں یعنی آیت الکرسی تم اس کو اپنے گھر میں پڑھو شیطان و جن تمہارے قریب نہیں آئیں گے۔ یہ صحابی رسول اللہ ﷺ کی جناب میں حاضر ہوئے حضور نبی اکرم ﷺ نے دریافت فرمایا، تمہارے قیدی نے کیا کیا اُنہوں نے اس جن کی کہی ہوئی بات بتائی حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اس نے سچ کہا حالانکہ وہ بہت بڑا جھوٹا ہے۔‘‘

یہ حدیث بھی گذشتہ حدیث کے مضمون پر واضح دال ہے اور اس سے یہ امر واضح ہوا کہ جنات ایک الگ مخلوق ہے اور ان کے شر سے بچنے کی انسان کو طاقت ودیعت ہوئی ہے۔ آیت الکرسی ہر طرح کے شر و فتنہ و فساد کے تدارک کے لئے اکسیرِ عظیم کا درجہ رکھتی ہے۔

۶۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔ سورۂ بقرہ میں ایک آیت ہے یہ قرآن کی آیتوں کی سردار ہے جس گھر میں یہ پڑھی جائے گی اگر اس میں شیطان ہے تو وہ یقیناً نکل بھاگے گا یہ آیت، آیت الکرسی ہے۔ (۱)

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کمزور نہیں بلکہ اسے شیطانی اور ابلیسی قوتوں پر غالب ہونے کی طاقت ودیعت ہوئی ہے۔ نفس اور شیطان کے سامنے ہتھیار ڈال کر یہ کہنا کہ میں کمزور ہوں یہ غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی کمزوریوں اور باطنی بیماریوں کے تدارک کے لئے قرآن حکیم نازل فرمایا۔

۷۔ حضرت امام ابن ضریر نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

عن قتادة رضي الله عنه قال: من قرأ آية الكرسي إذا أوى إلى فراشه وكّل به ملكين يحفظانه حتّى يصبح. (۲)

(۱) دارمی، السنن، کتاب فضائل القرآن، رقم: ۳۳۸۱

(۲) سیوطی، الدر المنثور، ۲: ۱۵

’’حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جو شخص بستر پر لیٹ کر آیۃ الکرسی پڑھتا ہے صبح تک دو فرشتے اس کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔‘‘

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص رات کو آیت الکرسی پڑھ کر سوتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے صبح کی نماز کی ادائیگی کی توفیق عطا فرماتا ہے اور وہ شیطانی حملوں سے محفوظ رہتا ہے۔

۸۔ حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے:

عن أبی بن کعب رضی الله عنه قال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم: والّذي نفسي بيده إنّ لها لسانا وشفتين تقدس الملک عند ساق العرش. (۱)

’’حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے آیت الکرسی کی ایک زبان اور دو ہونٹ ہیں وہ ساقِ عرش کے پاس مالکِ کائنات کی تسبیح و تقدیس کرتی ہے۔‘‘

آیت الکرسی کی یہ حقیقت اور عظمت ہے کہ اس کا تلاوت کرنے والا مسلسل ذکر کی لذتوں سے سرشار رہتا ہے اور وہ شخص حفاظتِ خداوندی میں رہتا ہے۔

۹۔ حاکم کی روایت ہے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے، میں آپ کے سامنے بیٹھ گیا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز، روزے اور صدقہ کے فضائل بیان کئے۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کے اوپر سب سے عظیم آیت کون سی نازل ہوئی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ’’اللہ لا الہ الّا ھو الحي القیوم‘‘ اخیر تک پڑھی۔ (۲)

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۵: ۱۴۲، رقم: ۲۱۳۱۵
۲۔ بیهقی، شعب الایمان، ۲: ۴۵۵، رقم: ۲۳۸۶

(۲) ۱۔ حاکم، المستدرک علی الصحیحین، ۱: ۵۶۱
۲۔ طبرانی، المعجم الکبیر، ۱: ۲۱، رقم: ۵۴۱

۱۰۔ خطیب نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے جو شخص آیت الکرسی پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ بذات خود اس کی روح قبض فرماتا ہے۔ (۱)

گویا آیت الکرسی کی کثرتِ تلاوت کے نتیجے میں وہ شخص اعزازاً یہ کمال وعزّت حاصل کرتا ہے۔

۱۱۔ ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جو ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ بذات خود اس کی روح قبض فرماتا ہے اور وہ اس مجاہد کا درجہ پاتا ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے نبیوں اور رسولوں کی جانب سے جہاد کیا ہو اور وہ اس میں شہید کیا گیا ہو۔ (۲)

۱۲۔ عن علي رضی اللہ عنہ قال سمعت رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم على أعواد المنبر يقول: من قرأ آية الكرسي دبر كلّ صلاة لم يمنعه من دخول الجنّة إلّا الموت ومن قرأها حين يأخذ مضجعه أمنه الله على داره ودار جاره ودويرات حوله. (۳)

’’حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھتا ہے اسے جنت میں داخل ہونے سے صرف موت روکے رکھتی ہے اس کا انتقال ہوا نہیں کہ جنت میں داخل ہوا اور جو شخص سوتے وقت آیت الکرسی پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گھر اور اس کے پڑوسی کے گھر اور اس کے آس پاس کے گھروں کو امان دے دیتا ہے۔‘‘

(۱) ۱۔ سعید بن منصور، السنن، رقم: ۴۲۱
۲۔ بیهقی، شعب الایمان، ۲: ۴۵۵
۳۔ سیوطی، الدر المنثور، ۱: ۳۲۳
(۲) ایضاً
(۳) ۱۔ بیهقی، شعب الایمان، ۲: ۴۵۸، رقم: ۲۳۹۵
۲۔ سیوطي، الدر المنثور، ۲: ۸

آیت الکرسی رحمانی حصار ہے۔ اہل اللہ قرآنی آیات کے دم سے اور ذکر سے جو بیماروں کے گرد حصار بناتے ہیں وہ اصلاً اس حدیث سے ثابت ہے۔ لہٰذا آیات و احادیث کے نورانی کلمات سے روحانی علاج کرنا شرعاً درست ہے۔ اسے ناجائز کہنا شرعا غلط ہے۔

۱۳۔عن علي بن أبي طالب رضی اللہ عنہ قال: ما أری رجلا أدرک عقله في الإسلام يبيت حتّی يقرأ هذه الآية. ﴿الله لا إله إلّا هو الحيّ القيوم﴾ ولو تعلمون ما فيها لما ترکتموها علی حال أنّ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال: أعطيت آية الکرسي من کنز تحت العرش ولم يؤتها نبي قبلي قال علي: فما بت ليلة قط منذ سمعت هذا من رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حتّی أقرأها.[۱]

’’حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں: میں کسی پختہ عقل مسلمان شخص کو نہ دیکھوں گا کہ یہ آیت ’’الله لا إله إلّا هو الحی القيوم‘‘ پڑھے بغیر وہ سوئے اگر تم جان لو کہ اس میں کیا ہے تو اسے کسی حال میں نہ چھوڑو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آیت الکرسی عرش کے نیچے سے مجھے دی گئی اور مجھ سے پہلے کسی اور نبی کو یہ نہ دی گئی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں جب سے میں نے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کبھی کوئی ایسی شب نہ گذری جس میں میں نے آیت الکرسی نہ پڑھی ہو۔‘‘

اس حدیث کے ہر راوی کا بیان ہے کہ جب سے یہ حدیث ہمیں پہنچی اس وقت سے اب تک ہم نے کسی بھی رات اس کا پڑھنا ترک نہ کیا۔

۱۴۔عن حسن بن علي رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: من قرأ آية

(۱) سيوطي، الدر المنثور، ۲: ۱۲

الكرسي في دبر الصلاة المكتوبة كان في ذمة الله إلى الصلاة الأخرى.(۱)

’’حضرت سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھے گا وہ دوسری نماز تک اللہ کے ذمہ اور حفاظت میں رہے گا۔‘‘

۱۵۔ عن عائشة رضی الله تعالیٰ عنها أنّ رجلا أتى النّبي ﷺ فشكا إليه أن ما في بيته ممحوق من البركة فقال: أين أنت من آية الكرسي ما تليت على طعام ولا أدامٍ إلّا أنمى الله بركة ذلك الطعام والأدام.(۲)

’’حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے ایک شخص حضور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے شکایت کی کہ اس کے گھر کی چیزوں میں کوئی برکت نہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: کیا تم آیت الکرسی نہیں پڑھتے؟ جس کھانے اور سالن پر تم آیت الکرسی پڑھو گے اللہ تعالیٰ اس کھانے اور سالن میں برکت دے گا۔‘‘

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ برکت ایک روحانی چیز ہے اور اس کا حصول قرآنی آیات و احادیث سے ثابت کلماتِ ادعیہ سے ہوتا ہے۔ اس کا انکار کرنا شرعاً غلط ہے۔

(۱) ۱۔ طبرانی، المعجم الکبیر، ۳: ۸۳، رقم: ۲۷۳۳
۲۔ منذري، الترغيب والترهيب، ۲: ۲۹۹، رقم: ۲۴۶۹
۳۔ هيثمی، مجمع الزوائد، ۲: ۱۴۸
۴۔ سيوطي، الدر المنثور، ۲: ۶
(۲) سيوطي، الدر المنثور، ۲: ۶

۱۶۔ علامہ خازن لکھتے ہیں: آیت الکرسی کو قرآن کریم کی عظیم ترین آیت ہونے کا امتیاز اس لئے حاصل ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے بنیادی اسماء و صفات کو حاوی ہے۔ مثلاً معبودیت، وحدانیت، حیات، علم، قیومیت، مالکیت، قدرت، ارادہ وغیرہ صفات اس میں پائی جاتی ہیں اور یہی اسماء وصفات میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں کیونکہ ذکر کی جانے والی چیزوں میں اللہ تعالیٰ سب سے عظیم ہے اس لئے اس کی توحید کا ذکر بھی تمام ذکروں میں عظیم ترین ہوگا۔

۱۷۔ عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال: ما من سماء ولا أرض ولا سهل ولا جبل أعظم من آية الكرسي.(۱)

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی مخلوقات جنت و دوزخ، آسمان و زمین میں سے کوئی بھی سورۂ بقرہ کی آیت آیت الکرسی سے زیادہ عظمت کی حامل نہیں۔''

اسی طرح امام بیہقی نے ''الاسماء والصفات'' میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے ان کا ارشاد ہے آسمان و زمین اور پہاڑ کوئی بھی آیت الکرسی سے عظمت میں بڑھا ہوا نہیں۔(۲)

۱۸۔ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: من قرأ آية الكرسي في دبر كل صلاة مكتوبة أعطاه الله قلوب الشاكرين وأعمال الصديقين وثواب النبيّين وبسط عليه يمينه بالرّحمة ولم يمنعه من دخولِ الجنّةِ إلّا أن يموت فيدخلها.(۳)

(۱) سيوطي، الدر المنثور، ۲: ۷
(۲) بيهقي، الأسماء والصفات، ۲: ۴
(۳) سيوطي، الدر المنثور، ۲: ۶

’’حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھتا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ شکر گذار بندے کا دل، صدیقین کا عمل اور انبیاء کا ثواب عطا فرماتا ہے اور اس کے اوپر اپنا دست رحمت پھیلاتا ہے اور وہ انتقال کرتے ہی جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔‘‘

۱۹۔ ابن اسحاق سے منقول ہے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اپنے باغ میں گئے تو اس میں شور سنا انہوں نے کہا یہ کیا، ایک جن نے جواب دیا: ہم قحط کا شکار ہو گئے ہیں اس لئے میں نے آپ کے پھل سے کچھ لینے کا ارادہ کیا ہے آپ اسے ہمارے لئے جائز کر دیجئے۔ انہوں نے کہا: ہاں میں نے تمہارے لئے جائز کر دیا۔ پھر زید بن ثابت نے فرمایا کیا تم ہمیں وہ نہ بتاؤ گے جس کے ذریعہ ہم تم سے بچ سکیں، اس نے کہا آیت الکرسی ہے اسے پڑھو تو کوئی جن و شیطان قریب نہیں آئے گا۔ (۱)

۲۰۔ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور ﷺ نے فرمایا: جو شخص کرب و اضطراب کے وقت آیت الکرسی اور سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس کی فریاد رسی فرمائے گا۔ (۲)

۲۱۔ أنّ رسول اللہ ﷺ قال: من قرأ آية الكرسي في دبر كل صلاة لم يكن بينه وبين أن يدخل الجنّة إلّا أن يموت فإن مات دخل الجنّة. (۳)

’’امام بیہقی نے حضرت صلصال رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ

(۱) خازن، لباب التأويل في معاني التنزيل، ۱: ۳۹۴
(۲) خازن، لباب التأويل في معاني التنزيل، ۱: ۳۹۳
(۳) ۱۔ بيهقي، شعب الايمان، ۲: ۴۵۶، رقم: ۲۳۵
۲۔ سيوطي، الدر النثور، ۲: ۶

نے فرمایا: جو شخص ہر نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھتا ہے اس کے اور جنت میں داخل ہونے کے درمیان موت کا فاصلہ ہوتا ہے جوں ہی وہ مرتا ہے جنت میں داخل ہوتا ہے۔‘‘

۲۲۔ عن ابن عمر عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ أنّه خرج ذات يوم إلى النّاس وهم سماطات فقال: أيّكم يخبرني بأعظم آية في القرآن فقال ابن مسعود رضی اللہ عنہ: على الخبير سقطت، سمعت رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يقول: أعظم آية في القرآن ﴿الله لا إله إلّا هو الحي القيوم﴾.(۱)

’’حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک دن لوگوں کے پاس آئے لوگ قطار میں بیٹھے ہوئے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا: تم میں سے کوئی قرآن کی سب سے عظیم آیت مجھے بتائے گا؟ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ حقیقت کے جاننے والے کے پاس تشریف لائے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: قرآن کی سب سے عظیم آیت ’’الله لا إله إلّا هو الحي القيوم‘‘ ہے۔‘‘

حاکم کی ایک اور روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قرآن کی آیتوں کی سردار آیۃ الکرسی ہے۔

آیۃ الکرسی کے فضائل کا خلاصہ

ان روایات میں آیۃ الکرسی کو عظیم ترین آیت اور آیتوں کی سردار فرمایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کئی ایک ثبوتی اور سلبی صفتیں بیان کی گئی ہیں۔ اس

(۱) ۱۔ ابن کثیر، تفسير القرآن العظيم، ۱: ۳۰۸
۲۔ سيوطي، الدر المنثور، ۲: ۷

کے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے متعلق بتایا کہ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور اس کی ایسی زندگی ہے جس کے لئے موت و قضا کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور وہ ایسا مستقل بالذات ہے کہ وہ سب سے بالکل بے نیاز ہے نہ اسے نیند آسکتی ہے نہ ہلکی سی اونگھ ، پھر اس نے اپنی مطلق بادشاہی کی خبر دی کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے اور اسی کے زیرِ نگیں ہے اور کوئی اس کی اجازت کے بغیر اس کے پاس سفارش نہیں کرسکتا۔ پھر اس نے بتایا کہ اس کے علم نے گذشتہ اور آئندہ کے تمام امور کا احاطہ کر رکھا ہے اور مخلوق میں صرف وہی جان سکتے ہیں جن کے جاننے کی اس نے اجازت دے رکھی ہے اور یہ بھی بتایا کہ اس کی کرسی آسمان و زمین سے بھی کہیں زیادہ وسیع ہے۔ آسمان و زمین اس کی کرسی میں ایسے ہی ہیں جیسے کہ چھوٹی سی انگوٹھی وسیع صحرا میں ڈال دی گئی ہو اور یہ بھی بتایا کہ آسمان و زمین اور ان کے اندر کی چیزوں کی حفاظت اس کے لئے کوئی بڑی بات نہیں اور وہ ایسا بلند ہے جس کے لئے ساری بلندیاں ہیں۔ ذات کی بلندی ایسی کہ کسی مخلوق میں اس بلندی کے ایک ذرہ کا بھی تصور نہ کیا جاسکے اور صفات کی بلندی ایسی کہ کسی مخلوق میں ویسی صفت کے ادنیٰ سے ادنیٰ حصہ کا تخیل نہ کیا جا سکے اور قہر کی بلندی ایسی کہ وہ اپنے بندوں کے اوپر قاہر مطلق حقیقی اور قدر و شرف کی بلندی ایسی کہ وہ اپنے مجد و شرف میں کامل و اکمل اور اس سے بھی باخبر کیا کہ وہ ایسی عظمت والا جس کی عظمت کی کوئی حد نہیں۔

لطائف

آیت الکرسی سے چند فوائد مستنبط کیے گئے ہیں:

۱۔ پہلا فائدہ یہ ہے کہ سارا قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ مگر اس کی آیات کی تاثیرات جُداگانہ ہیں۔ جیسے تمام انبیاء و اولیاء اللہ تعالیٰ کے پیارے ہیں مگر اُن کے مراتب مختلف ہیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے اُصولی اسماء و صفات یہ ہیں: وحدانیت، حیات، قیومیت، علم، ملک، قدرت اور ارادہ چونکہ آیت الکرسی میں ان سب کا ذکر موجود ہے اس لئے یہ آیت عظم اذکار ہے۔

۳۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے شیطان بھاگتا ہے، بے چین دل کو چین آتا ہے۔ اس سے غصہ، شر اور حرام شہوات دور ہوتی ہیں اور دین و دنیا کی حفاظت ہوتی ہے۔ لہٰذا آیت الکرسی کو اخلاص کے ساتھ پڑھنے سے دین و دنیا کے دونوں فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

آیت الکرسی کے جملوں میں منطقی ربط

آیت الکرسی کی یہ عظمت اظہر من الشّمس ہے کہ توحیدِ باری تعالیٰ کا بیان نہایت پُرشکوہ انداز میں بیان کیا گیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ توحید ہی دینِ اسلام کا اصل الاصول ہے۔

آیت الکرسی سے اللہ تعالیٰ کی شانِ احدیت وصمدیت کے پُرشکوہ اِثبات اور کسی کے کسی بھی اعتبار سے اِس کے ہم پلہ، ہم جنس اور ہم کفو ہونے کی ہمہ جہتی نفی سے شرک فی الذات کا کامل سدّ باب کر دیتی ہے۔ ذاتِ واجب الوجوب کی صفاتِ کاملہ کا بیان ایسے پُرجلال اور پُر ہیبت انداز میں ہوا ہے کہ ہر طرح کے شرک کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ توحید فی الالوھیت اور شرک فی الالوھیت، توحید فی الربوبیت اور شرک فی الربوبیت، توحید فی الذات اور شرک فی الذات، توحید فی الخلق و الایجاد اور شرک فی الخلق و الایجاد، توحید فی العبادت اور شرک فی العبادت، توحید فی القدرت اور شرک فی القدرت، توحید فی الدعاء اور شرک فی الدعا، توحید فی العلم اور شرک فی العلم، توحید فی الاسماء والصفات اور شرک فی الاسماء والصفات، توحید فی الافعال اور شرک فی الافعال، توحید فی التحریم اور شرک فی التحریم، توحید فی النذور اور شرک فی النذور، توحید فی الحلف اور شرک فی الحلف، توحید فی

الاحکام اور شرک فی الاحکام جیسی اہم اور نازک مباحث کو آیت الکرسی کی روشنی میں بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

توحید اور شرک کے تعین کا واضح منہاج سمجھ میں آ جائے تو ہر طرح کے اعتقادی خلفشار کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں ہماری مطبوعہ کتاب ''کتاب التوحید'' کا مطالعہ کیا جائے۔

یہ آیت مبارکہ دس مستقل جملوں پر مشتمل ہے:

پہلا جملہ

''اَللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ'' غیر اللہ سے صفتِ اُلوہیت کی کامل نفی کر دیتا ہے۔ یہ حقیقت باور کرائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تنہا معبودِ برحق، مطلوبِ اصلی اور محبوبِ حقیقی ہے۔ گویا یہ دعویٰ ہے اور آئندہ اس کے دلائل پیش کیے گئے ہیں۔

دوسرا جملہ

''اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ'' اللہ تعالیٰ کے اُن دو عظیم اسماء پر مشتمل ہے کہ جن کے بارے میں منقول ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے ''اسمِ اعظم'' کی حیثیت حاصل ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں زندہ جاوید اور از خود قائم و دائم ہے اور ماسوی اللہ کے لئے القیوم ہے۔ اس کا وجود ذاتی اور حیات بھی ذاتی ہے اور ماسوٰی اللہ کی ہر صفت خالص عطائی اور نری مستعار ہے۔ لہٰذا حقیقی اور مجازی کی تقسیم کے بغیر شرک کا صحیح تصور سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

www.MinhajBooks.com

تیسرا جملہ

''لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ'' میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ حیات کے کامل کی وضاحت و تصریح کی گئی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی حیات ہر ضعف و احتیاج سے مستغنی ہے۔ لہٰذا اس طرف بلیغ اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتی ہونے کے علاوہ کامل بھی ہیں اور

مطلق بھی، اِس کے برعکس مخلوقات کی صفات وہبی، عطائی ہونے کے ساتھ ساتھ مقید اور حادث ہیں۔

چوتھا جملہ

''لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ'' اللہ تعالیٰ کی شانِ قیومی کے لازمی منطقی نتیجے کی وضاحت وصراحت پر مشتمل ہے۔ یعنی جب جُملہ موجودات کا وُجود ہی اللہ تعالیٰ کی توجہ اور کرم کا مرہونِ منت ہے اور موجوداتِ عالم کے بقاء ومنہاج کا پورا دار و مدار ہی اس کی نگاہِ عنایت پر ہے تو لازمًا یہ سلسلہ کون و مکان کل کا کل اُسی خالق و مالک معبودِ حقیقی کی ملکیت ہے اور اُسے ہی اس میں کامل تصرف کا اختیار حاصل ہے۔

لہٰذا اس میں مالک الملک ہونے کا بیان بھی ہے اور ''الملک الحق'' ہونے کا اعلان بھی۔ علامہ اقبالؒ نے اِس کی تفسیر یوں بیان کی ہے۔

سروری زیبا فقط اِس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بُتانِ آذری

پانچواں جملہ

''مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ'' میں شفاعتِ باطلہ کا ردّ اور شفاعتِ صحیحہ کا اثبات کیا گیا ہے۔ یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ شفاعت ایک خالص عطائی اعزاز ہے یہ کسی کا استحقاقِ ذاتی نہیں ہے۔ لہٰذا باذنہ سے ثابت ہوا کہ ذاتی اور عطائی کی تقسیم منزل من اللہ ہے۔ یہ تقسیم خود تراشیدہ نہیں ہے بلکہ قرآن وسنت سے متحقق ہے، کیونکہ اس تقسیم کے بغیر شرک اور توحید کا واضح تصور سامنے نہیں آ سکتا اور اگر یہ تقسیم سمجھ میں آ جائے تو اعتقادی خلفشار کا سدّ باب بآسانی ہو جاتا ہے۔

چھٹا اور ساتواں جملہ

’’یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ ج وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ‘‘ یہ دونوں جملے اللہ تعالیٰ کی شانِ اُلوہیت و قیومیت کے بیان اور اُس کی صفاتِ کاملہ میں سے وجودِ واجب، حیاتِ کاملہ، قُدرتِ مطلقہ، ملکیتِ تام اور اختیارِ کلی کی بالواسطہ تصریح کے بعد ان جملوں میں خالق اور مخلوق کے علم کے تقابل سے واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ذاتی بھی ہے اور کامل بھی، ما بین أیدیھم کو بھی محیط ہے اور ما خلفھم کو بھی۔ اس کے برعکس ماسوی اللہ کا علم مقید، محدود اور خالص عطائی اور وہبی ہے۔

چنانچہ اولیاء و انبیاء، ملائکہ ارواح اور جنات غرض کسی کے پاس اپنا ذاتی علم کوئی نہیں۔ ذاتی کی نفی ہے اور عطائی و وہبی کا اثبات ہے۔ پس ماسوی اللہ سے ذاتی کی نفی اور عطائی کا اثبات ہی اصلِ توحید ہے۔

آٹھواں اور نواں جملہ

’’وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ج وَلَا یَؤُوْدُہٗ حِفْظُھُمَا‘‘ میں اللہ تعالیٰ کے غلبہ و اقتدار کی وسعت اور اُس کے قبضہ و اختیار کی ہمہ گیری کی ایک جھلک نہایت پُرجلال و پُر ہیبت الفاظ میں دکھائی گئی ہے۔ یعنی آسمانوں اور زمینوں کی تمام وسعتیں اللہ تعالیٰ کے حیطۂ اقتدار میں ہیں اور پوری کائنات اُسی کے زیرِ نگیں ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی ملک بے کراں کے حفظ و امان اور اِس سلطنت بے پایاں کے انتظام و انصرام سے ہرگز کسی درجے میں بھی عاجز و قاصر اور لاچار نہیں۔

www.MinhajBooks.com

دسواں جملہ

’’وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ‘‘ دو اسمائے حسنٰی پر مشتمل ہے یعنی وہ بلند و بالا بھی ہے اور بزرگ و برتر بھی اور صاحبِ عظمت وسطوت بھی ہے اور حاملِ شان وشوکت و بلندی بھی۔

آیت الکرسی میں ذاتِ واجب الوجود کی صفاتِ کاملہ میں سے قدرتِ مطلقہ اور اختیارِ کاملہ پر حد درجہ زور دینے کے ساتھ اہم صفات یعنی حیات اور علم کے حوالے سے یہ بنیادی حقیقت واضح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کے وجود ہی کی طرح ذاتی بھی ہیں اور غیر محدود و لامتناہی بھی۔ جبکہ اس کے برعکس مخلوقات کی صفات ان کے عین وجود کی مانند خالص عطائی و وہبی بھی ہیں اور مقید و حادث بھی۔ گویا اللہ تعالیٰ کا وجود بھی حق اور صفات بھی حقیقی اور ہم سب کا وجود بھی محض وہمی اور صفات بھی نری اعتباری۔

الغرض آیت الکرسی اللہ تعالیٰ کے وجود، حیات، قدرت اور علم ایسی بنیادی صفات کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی شانِ یکتائی کے بیان میں منفرد مقام کی حامل ہے اور یہی وجہ ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے اسے قرآن کریم کی عظیم ترین آیت بھی قرار دیا اور تمام آیاتِ قرآنی کی سردار بھی۔

آیت الکرسی اور اسماء و صفاتِ باری تعالیٰ

امام جلال الدین سیوطیؒ کے نزدیک جس قدر آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کے اسماء گرامی مذکور ہیں، اِس قدر کسی دوسری آیت میں مذکور نہیں۔ آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کے سترہ اسماء گرامی مذکور ہوئے ہیں، بعض ظاہراً اور بعض اشارۃً و کنایۃً۔ جن کا بیان اِس امر پر دلالت کرتا ہے کہ آیت الکرسی کے مضامین اللہ تعالیٰ کی معرفتِ علمی کے حصول کے لئے مینارۂ نور کا درجہ رکھتے ہیں۔

وہ سترہ اسماء و صفاتِ باری تعالیٰ درج ذیل ہیں۔

۱۔ اللہ ۲۔ ھو ۳۔ الحیّ ۴۔ القیّوم

۵۔ لا تاخذوہ کی ضمیر ۶۔ لہٗ کی ضمیر ۷۔ عندہ کی ضمیر ۸۔ باذنہ کی ضمیر

۹۔ یعلم کی ضمیر ۱۰۔ علمہ کی ضمیر ۱۱۔ شاء کی ضمیر ۱۲۔ کرسیّہ کی ضمیر

۱۳۔ یودّہ کی ضمیر

۱۴۔ حفظھما کی ضمیر مستتر جو مصدر ''الحفظ'' کی فاعل ہے۔

۱۵۔ ھو ۱۶۔ العليّ ۱۷۔ العظيم

اللہ تعالیٰ کے مذکورہ بالا اسماء اور صفات میں سے ہر اسم اور ہر صفت اِس امر پر دلالت کرتی ہے کہ تمام تعریفوں کی مستحق ذاتِ واجب الوجود ہے۔ وہی حق دارِ اُلوھیت ہے۔ وہی خالق و مالک ہے اور صرف وہی ''اله'' کہلانے کا حق رکھتی ہے۔

وہ خود ہر کمال کی مالک ہے اور ہر کمال کا منبع و سرچشمہ بھی۔ ہر کمال اُسی سے شروع ہوتا ہے اور اُسی پر ختم ہوتا ہے۔ اِن صفات کے بیان کرنے میں مصلحت یہ ہے کہ اِنسان یہ جان سکے کہ باری تعالیٰ صرف خود ہی ''العلي، علیم اور عظیم نہیں بلکہ اپنی مخلوق کو بھی ہر ایک کے حسبِ حال اِن صفات کی خیرات سے نوازتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی وہ صفات ہیں جن سے اُس کی علمی معرفت کی راہ نصیب ہوتی ہے۔ اِس لحاظ سے آیت الکرسی معرفتِ الٰہی کا خزانہ بھی ہے اور اِس کے وصال و قرب کا راستہ بھی۔ نیز جس طرح آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کے سترہ اسماء و صفات مذکور ہوئے ہیں اسی طرح ہر ایک صفتِ اُلوھیت کے مقابلے میں ایک صفتِ عبدیت ہے۔ اِس اعتبار سے صفاتِ عبدیت بھی تعداد میں سترہ بیان کی جا سکتی ہیں۔

آیت الکرسی ربط بین الآیات کی روشنی میں

شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ تفسیر عزیزی میں لکھتے ہیں کہ آیت الکرسی سورۂ بقرہ کا قلب ہے اور ''الحيّ القيوم'' بمنزلہ روح اور جان کے ہے اور باقی تمام آیات اعضاء اور جوارح کی مانند ہیں۔ لہٰذا سورۂ بقرہ کے تمام مطالب و مضامین اسی آیت کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ جس طرح اعضاء و جوارح جان کے شئون اور مظاہر ہوتے ہیں اسی طرح سورۂ بقرہ کی تمام آیات ''الحيّ القيوم'' کے شئون اور مظاہر ہیں۔ سورۂ بقرہ

دو سو چھیاسی آیات اور چالیس رکوع پر مشتمل ہے۔ کوئی ایسا رکوع نہیں کہ جس میں حیات اور قیومیت اور ہمیشہ کی زندگانی کا مضمون مذکور نہ ہو۔ گویا سورۂ بقرہ ''الحيّ القيوم'' ہی کی شرح اور حیات و قیومیت ہی کی وضاحت وتوضیح ہے۔ ''ذالک الکتاب لا ریب فیه'' سے قرآن حکیم کا آبِ حیات ہونا بیان کیا گیا اور یہ حقیقت واضح کی گئی کہ ایمان اور تقویٰ ہی سے حیاتِ ابدی حاصل ہوتی ہے اور کفر و نفاق سے دائمی ہلاکت و بربادی۔ پھر تیسرے رکوع میں افراد اِنسانی کی حیات کا ذکر کیا ''وکنتم امواتا فاحیاکم'' اور زمین و آسمان کی پیدائش اور دنیا کی نعمتوں کی تخلیق کا ذکر کیا جو حیاتِ دُنیوی کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا حکم دیا جو انسان کی حیاتِ اُخروی اور قیامِ ابدی کا ذریعہ ہے۔ اس کے بعد حضرت آدم ں کی حیات،، منصبِ خلافت اور ملائکہ پر اُن کی فضیلت کا راز آشکار فرمایا۔ بعد ازاں بنی اسرائیل کی حیات اور اُن پر قدرتِ خداوندی کے ظاہری اور باطنی انعامات کا بیان ہوا، جو تقریباً اخیر پارے تک محیط ہے۔ بنی اسرائیل کی جہانوں پر فضیلت، من وسلویٰ کا نازل ہونا اور اُن کی ہدایت کے لئے تورات کا نازل ہونا اور اس قوم میں ہزاروں پیغمبروں کو ہدایت کے لئے مبعوث کیا جانا بیان کیا گیا۔ جب بنی اسرائیل کا قصہ تمام ہوا تو ایک دوسرے خاندان کی حیات کا ذکر کیا گیا یعنی حضرت اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام اور اُن کی اقامت اور بیت اللہ کی تعمیر کا ذکر ہوا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش کی جگہ اور کعبۃ اللہ کو آخری قبلہ بیان کیا۔ تحویلِ قبلہ کی تفصیلات بیان کر کے حقیقی حیات پر روشنی ڈالی گئی۔ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کی حیات کے سربستہ رازوں کو منکشف کرنے کے بعد چند اقسامِ حیات کا ذکر کیا۔ شہادت فی سبیل اللہ، مصائب پر صبر کرنا، قصاص کو جاری کرنا، وصیت کو بغیر تغیر و تبدُّل کے جاری کرنا، روح کو زندہ رکھنے کے لئے روزہ رکھنا، دین کی بقاء کے لئے جہاد کرنا، شعائرِ ملتِ ابراہیمی کو زندہ اور قائم رکھنے کے لئے حج و عمرہ کرنا، مال و آبرو کی حیاتِ حقیقی قائم رکھنے کے لئے شراب اور جوئے سے پرہیز کرنا، حقوقِ نکاح اور زوجیت کے زندہ اور قائم رکھنے کے لئے ایلاء، خلع، طلاق، عدّت، آدابِ مباشرت اور اُجرتِ رضاعت وغیرہ کی حدود کی پوری پوری رعایت رکھنا

تاکہ خاندانی نظام اور معاشرتی حیات سلامت رہے اور اس کی وحدت منتشر نہ ہو۔ اِن اقسامِ حیات کی تفصیلات کے ذکر کے بعد چند عجیب و غریب قصص بیان کئے گئے، جن میں اللہ ''الحيّ القيوم'' کی طرف سے بغیر ظاہری اسباب کے حیاتِ غیبیہ عطا ہونا بیان کیا گیا تاکہ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سواء کوئی ''الحيّ القيوم'' نہیں، جو زندہ اور موجود ہے۔ وہ ربِ ذوالجلال کی دی ہوئی حیات سے قائم اور زندہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دو قصے اس کلمہ ''الحيّ القيوم'' سے پہلے ذکر کیے اور تین واقعات اِس مدعا کے اثبات کے لئے آیت الکرسی کے بعد ذکر فرمائے۔

پہلا واقعہ حیاتِ بنی اسرائیل کے اُس گروہ کا ذکر فرمایا جو وبا سے ڈر کر بھاگا اور پھر ایک اولوالعزم نبی کی دعا سے زندہ ہوا۔

دوسرا واقعہ طالوت اور جالوت اور تابوتِ سکینہ کا ذکر کیا جس سے اس خاندان کی گم شدہ حیاتِ جاوداں پھر واپس آ گئی۔ اس کے بعد آیت الکرسی کا ذکر کیا جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی بے مثل حیات، قیومیت، مالکیت، عظمت، ہیبت، قدرتِ کاملہ اور علمِ محیط کا ذکر فرمایا اور یہ واضح کر دیا کہ اِسلام سیدھا راستہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وحدہ لا شریک مانا جائے، حق واضح ہے جس کا جی چاہے قبول کرے کسی پر زبردستی نہیں۔ اِس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی حیات اور قیومیت کے اِثبات کے لئے تین واقعات کا ذکر فرمایا ہے کہ جس سے حیاتِ اُخروی کا نمونہ معلوم ہو اور یہ واضح ہو جائے کہ وہ ''الحيّ القيوم'' ربِ ذوالجلال مُردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے تاکہ لوگ قیامت کے دن پر شک نہ کریں۔ پھر اس کے بعد صدقات و خیرات کے احکام بیان کیے جو انسان کی دینی و دُنیوی زندگی کے قیام کا سبب ہیں اور سُود سے پاک معیشت کا بیان کیا اور واضح لفظوں میں سود کی ممانعت فرمائی کہ جو اِنسان کی دینی و دُنیوی حیات کی تباہی اور بربادی و ہلاکت کا باعث ہے۔ پھر اِس سورت کو ایمانیات، اعتقادیات اور دُعا و استغفار کے مضمون پر مکمل فرمایا۔ اس لئے کہ یہ حقیقت ہے کہ ایمان، توبہ اور اِستغفار ہی سے بنجر و ویران اور مُردہ دلوں کو حیاتِ جاودانی

نصیب ہوتی ہے۔

الغرض سورۂ بقرہ اللہ تعالیٰ کے اِسم ''الحيّ القيوم'' کی شرح وتفصیل ہے اور آیت الکرسی سورۂ بقرہ کے لئے دل کی مانند ہے اور یہ اسم ''الحيّ القيوم'' بمنزلہ جان ہے اور باقی تمام آیات اعضاء وجوارح کی طرح ہیں۔

آیت الکرسی کے عارفانہ نکات

اسمِ جلالت ''اللہ'' اسمِ اعظم ہے اور دلوں کا چین ہے، ہر طرح کی جسمانی اور روحانی بیماریوں کا علاج اس کے ورد کرنے میں پوشیدہ ہے۔ اسی طرح ''الحي القيوم'' کو بھی اسمِ اعظم کہا گیا ہے۔ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات پر مشتمل ہیں۔ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر انہی دو اسموں سے تجلی فرماتا ہے تو بندہ پر ''الحي'' کی صفت کی تجلی سے اللہ رب العزت کے جمیع اسماء وصفات منکشف ہو جاتے ہیں اور بندہ اللہ تعالیٰ کی صفت ''القیوم'' کی تجلی سے جمیع مخلوقات کی فناء کا مشاہدہ کرتا ہے، کیونکہ تمام مخلوقات کا قیام ذاتی نہیں ہے۔ جملہ مخلوقات کا وجود وہمی اور اعتباری ہے۔ جب بندہ صرف ''الحي القيوم'' کو ہی دیکھتا ہے تو پھر ''الحي'' کے جلوہ سے جمیع اسماء کا حصول اور ''القیوم'' سے تمام مخلوقات کی نفی نصیب ہوتی ہے تو دوئی اٹھ جاتی ہے اور کثرت اور دوئی کے اٹھنے سے وحدت نصیب ہوتی ہے۔ اس طرح ''یاحي یاقیوم'' کا ورد کرنے سے بندہ مستجاب الدعوات بن جاتا ہے۔ حالتِ حضوری میں ہر اسم جس کا بھی ورد کیا جائے گا وہی اُس کے لئے اسمِ اعظم بن جائے گا۔

قلب پاک ہو تو ہر اسم، اسمِ اعظم ہے

حضرت بایزید بسطامیؒ سے اسمِ اعظم کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؒ نے فرمایا: اس کی کوئی حدود نہیں، ہاں یوں ہوسکتا ہے کہ اپنے دل کو وحدانیت کے لئے فارغ کر لیا جائے۔ پھر جس اسم کو یاد کرو گے وہی اسمِ اعظم ہو گا۔

دراصل حقیقتِ محمدیہ ہی اسمِ اعظم ہے، جسے حقیقتِ محمدیہ کی معرفت نصیب ہوگی اُسے علمِ اسمِ اعظم حاصل ہوگیا اور یہی اسم جامع الٰہی کی صورت ہے۔ کیونکہ اسی سے ہی تمام مخلوق کو فیض نصیب ہوتا ہے۔

''سنۃ ولا نوم'' کا حاصل یہ ہے کہ سالک پر لازم ہے کہ وہ کثرتِ نیند کی عادت ترک کرے، اگرچہ اللہ رب العزت نے بندوں کو نیند کی اجازت بخشی ہے لیکن کثرت سے غفلت پیدا ہوتی ہے اور غافل کو اللہ تعالیٰ محبوب نہیں بناتا۔

اہل اللہ پر وارداتِ ولایت کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب وہ رات کو دن بنا دیتے ہیں یعنی بکثرت بیداری کے باعث۔ اس لئے حضرت بابا فریدؒ نے فرمایا:

اُٹھ فریدا سُتیا تو جھاڑو دے مسیت
تو سُتا رب جاگدا تیری ڈاہڈے نال پریت

اللہ تعالیٰ ہی کی ذات مقصود و مطلوب ہے۔ اس کی طرف سے آنا ہوا اور سب نے اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ ہر ایک نے اپنے کیے کی جزا پانی ہے۔ وہ زندہ ہے، اس کی زندگی کی نہ ابتداء ہے نہ انتہاء۔ تمام مخلوقات کو صفات ربِ کائنات کی طرف سے عطا ہوئی ہیں۔ ساری کائنات میں معطی مطلق ایک ہی ہے۔ اسی لیے نظامِ ربوبیت میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ خالقِ کائنات کا کام جاری تھا، جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ اس کا لازوال و بے مثل ہونا کائنات کے توازن و اعتدال سے اظہر من الشمس ہے۔

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اُسی کا ہے، اِسی کے لئے نہیں ہے کیونکہ اُسے کسی بھی چیز کی حاجت نہیں۔ جب سب کچھ اُسی مالک الملک کا ہے تو پھر سب کچھ مالکِ حقیقی اور معطی مطلق کی رضا کے مطابق ہی استعمال ہونا چاہیے، ورنہ ناشکری بھی ہو گی اور مالک الملک سے دوری بھی۔ شفاعت کی توفیق ربِ ذوالجلال کی طرف سے عطا ہوتی ہے اور محبوبانِ بارگاہِ الٰہی ہی اس مقام اور شان کو پاتے ہیں۔ ان کا بولنا خواہشِ نفس

کے تابع نہیں ہوتا ''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىo اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰیo'' کے نُطق سے جو فیض یاب ہوتے ہیں وہی اس کے اذن سے سرفراز ہوتے ہیں کیونکہ شفاعتِ الٰہی اذنِ الٰہی سے تعلق رکھتی ہے، مخلوق کی ابتداء بھی اُس کے سامنے ہے اور انتہاء بھی۔ اس سے کچھ بھی پنہاں و مخفی نہیں ہے۔ اللہ رب العزّت کا علم کلی ہے جس قدر وہ عطا کرنا چاہے اُسی قدر ہی حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے جہاں بھی تکبر، غرور اور بڑائی کا دعویٰ ہوگا علمِ نافع نہیں ہوگا۔ علمِ نافع کی علامت یہ ہے کہ وہ علمِ الٰہی کے تابع ہو اور الٰہی نظام کے تابع علم وہی ہوتا ہے جو اپنی بھی حفاظت کرے اور دوسروں کی بھی حفاظت و نگرانی کرے، کیونکہ علم کی حقیقت حفاظت ہے، بندگی کے دائرے میں حفاظت کا حق ادا کرنے کی ایک صورت ہے کہ ''العلي العظيم'' کی معیت حاصل ہو۔

اللہ تعالیٰ نے عالمین میں جو کچھ پیدا فرمایا ہے اس کی مثال اور نمونہ انسان میں ضرور بنایا ہے، لہٰذا عرش کی مثال عالمِ انسان میں اس کا قلب ہے، کیونکہ یہ محلِ استواء الروح ہے اور کرسی کی مثال سر الانسان ہے، لہٰذا ''قلب المؤمن عرش الله'' کہ مومن کا قلب عرشِ الٰہی ہے۔ اس لذت سے فیضیابی کے لئے ضروری ہے کہ آیت الکرسی کو وردِ زبان رکھا جائے۔ ظاہر و باطن کی حفاظت کے لئے آیت الکرسی کی تلاوت اکسیر ہے، وساوس، اوہام اور دل سے کدورتوں، نفرتوں، عداوتوں اور بُغض و کینہ کو نکالنے کے لئے اور باطل افکار کے سدّ باب کے لئے آیت الکرسی کی تلاوت نسخۂ شفاء ہے۔ اس لئے ظاہر و باطن کی پاکیزگی اور رعنائی خیال کے لئے اہل اللہ نے آیت الکرسی کو کثرت سے پڑھنا محبوب قرار دیا ہے۔

www.MinhajBooks.com

اللّٰہُ لَا اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ کا معنٰی

"اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔"

لفظ اللہ کے تفسیری معارف

لفظ اللہ اِسم ذات کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس سے مراد ذات واجب الوجود ہے ۔ لفظ اللہ کے علاوہ باقی جتنے بھی اسماء الحسنٰی ہیں اس ذات کی صفات ہیں۔ لفظ اللہ کو قرآن و حدیث میں بار بار ذات واجب الوجود کا ادراک کرانے کے لئے اِستعمال کیا گیا ہے۔ قرآن حکیم کے اندر یہ اِسم ذات ستائیس سو ایک (۲۷۰۱) مرتبہ آیا ہے۔ اِتنی کثرت سے کوئی دوسرا لفظ قرآن حکیم میں اِستعمال نہیں ہوا۔ کہیں یہ الف لام کے ساتھ بصورتِ معرفہ اور کہیں بغیر الف لام کے بصورتِ نکرہ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام اُس کی مختلف صفات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اِن میں سے کوئی بھی ایسا اِسم نہیں ہے جو جمیع صفاتِ الوہیت کا احاطہ کر سکے۔ لفظ اللہ ایک ایسا نام ہے جس کی دلالت اُس واجب الوجود پر ہے جو جامع صفات و کمالات ہے۔ یہ ذاتِ حق کی کسی ایک یا چند صفات کی نہیں بلکہ بیک وقت ذات اور اُس کی تمام صفات کی نشاندہی کرتا ہے۔ صفات ایک اعتبار سے گویا ذات کا حصہ ہوتی ہیں۔ جبکہ ذات اپنی کسی بھی صفت کا حصہ نہیں ہوتی۔ ذات کے دامن میں اُس کی تمام صفات از خود موجود ہوتی ہیں۔ اس لئے اِسمِ ذات ہی جملہ صفات و کمالات کو پورے طور پر محیط ہوتا ہے۔ آیۃ الکرسی میں بھی صفات و افعال الٰہی کے بیان کا آغاز اِسم ذات سے ہوا ہے۔ قرآن حکیم نے ذاتِ باری تعالیٰ کا تعارف اِسی مقدس نام کے ذریعے کرایا ہے۔ بلکہ ہمیشہ اپنی صفات و کمالات کا ذکر بھی اِسی نام سے شروع کیا ہے۔ آیۃ الکرسی کا یہ اندازِ بیان نہ صرف اس کے اِسم ذات ہونے پر بلکہ اِس کی اہمیت،

جامعیت اور ہمہ گیریت پر بھی دلالت کرتا ہے۔ یہ لفظ صرف ذاتِ باری تعالیٰ کے نام کے طور پر وضع کیا گیا ہے اور بلاشرکت غیرے اِسی پر ہی دلالت کرتا ہے۔ جب ہم اِس لفظ کی شانِ علمیت پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اِس ذات والا صفات کے بیان کے لئے واقعی اِس سے زیادہ موضوع لفظ کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا۔لفظ اللہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے امام خازنؒ لکھتے ہیں:

هو اِسم علم خاص لله تعالىٰ تفرد به الباری سبحانه وتعالیٰ ليس بمشتق و لا يشركه فيه أحد. (۱)

''یہ اسم علم ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے اور باری تعالیٰ کی وحدانیت پر دلالت کرتا ہے نہ یہ کسی سے مشتق ہے اور نہ اس میں کوئی اور شریک ہے۔''

اس لفظ کا باری تعالیٰ کے اسم ذات کی حیثیت سے مستعمل ہونا کئی حکمتوں کی بناء پر ہے۔ ان میں سے ایک اس کی ترکیب لفظی میں پنہاں ہے۔ اگر اس لفظ سے کوئی حرف حذف بھی کر دیا جائے تب بھی بقیہ حروف ذاتِ باری تعالیٰ کی نشاندہی کے لئے اپنا معنی برقرار رکھتے ہیں۔ مثلاً اللہ کا پہلا حرف 'الف' حذف کر لیں تو 'للہ' باقی رہ جائے گا جس کا معنی ہے 'اللہ کے لئے'۔اگر دوسرا حرف 'لام' حذف کر لیں اور پہلا 'الف' بحال رکھیں تو 'الہٰ' باقی رہ جائے گا جس کا معنی ہے 'معبود'۔ اگر پہلے دونوں حروف 'الف' اور لام' حذف کر لیں تو 'لہٗ' باقی رہ جائے گا جس کا معنی ہے 'اس کے لئے' اور اگر پہلے تینوں حروف حذف کر لئے جائیں تو 'ہ' باقی رہ جائے گا جو پھر اس کی ذات کی نشاندہی کرتا ہے۔'ہ' 'وہ' کے معنی میں بطور ضمیر اِستعمال ہوتا ہے اور صوفیاء بالعموم اس کا ذکر کرواتے ہیں گویا ''اللہ'' ایک ایسا لفظ ہے جو من حیث الکل بھی اور اپنے ہر حرف اور جزو کے اعتبار سے بھی ذات حق پر معنوی دلالت کرتا ہے۔ اس نام کی ترکیب لفظی کے حسن کا یہ عالم ہے کہ اس کا کوئی حرف یا کوئی حصہ بھی بے معنی نظر نہیں آتا۔ گویا یہ لفظ بھی ذاتِ باری تعالیٰ کی طرح ہر ہر

(۱) خازن، لباب التأويل في معاني التنزيل، ۱: ۱۳

اعتبار سے کامل ہے۔ کسی اسم کی اپنے مسمّٰی پر اس سے زیادہ دلالت کا اور کیا تصور ہوسکتا ہے۔

لفظ اللہ جامع اور مانع شان کا حامل ہے

بعض محققین کے نزدیک لفظ ''اللہ'' اِسم علم غیر مشتق ہے جبکہ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ لفظ اِسم مشتق ہے۔ اِس لحاظ سے اِس کے متعدد مادے بیان کئے گئے ہیں۔ اِن میں سے ہر ایک مشتق منہ معنوی طور پر ذات باری تعالیٰ کی مختلف شانوں اور حیثیتوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ عام طور پر اہل علم یہ تصور کرتے ہیں کہ اس لفظ کی اصل ''الٰہ'' ہے جس کا معنی ''معبود'' ہے۔ جو ''ال'' کے اضافے سے معرفہ ہو کر ''اللہ'' قرار پا گیا۔ ''لام تعریف'' کے بارے میں عربی زبان کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی اسم کو معرف باللام کر دیا جائے (یعنی اس کے آغاز میں ''ال'' کا اضافہ کر دیا جائے) تو وہ اِسم اپنے اِستعمال اور اطلاق میں خاص ہو جاتا ہے۔ مثلاً کتاب کا لفظ عام ہے۔ کسی بھی کتاب پر اس کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ اگر اسے الکتاب کر دیا جائے تو اِس کا اطلاق صرف کسی مخصوص کتاب پر ہوگا۔ ہر ایک پر نہیں۔ اسی طرح الٰہ کو معروف کر کے اللہ بنانے میں یہی مصلحت تھی کہ الوہیت صرف ذات حق سے مختص تصور کی جائے اور پوری کائنات میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی اور ہستی الٰہ کہلانے کی مستحق نہ رہے۔ یہی مفہوم کلمہ توحید کے پہلے حصے کے ذریعے ادا ہوتا ہے۔ اگر باری تعالیٰ کو صرف الٰہ کہہ کر ہی پکارا جاتا تو اس سے اس کی شان الوہیت اور شان معبودیت تو آشکار ہوتی لیکن معبودانِ باطلہ کی نفی نہ ہوسکتی۔ گویا صرف ''اثبات'' ہوتا، نفی کا بیان نہ ہوتا۔ اس طرح یہ اِسم جامع ضرور تصور کیا جاتا لیکن مانع نہ ہوتا اور اِسم باری تعالیٰ کی انفرادیت وموزونیت کے لئے ضروری تھا کہ وہ جامع بھی ہو اور مانع بھی۔

نفی و اثبات کی حکمت

چنانچہ اس حکیم وخبیر نے اپنی ذات کی دلالت کے لئے ایسے لفظ کو منتخب فرمایا جو

بیک وقت اِس کے لئے الوہیت کا اثبات اور اس کے ماسوٰی کے لئے الوہیت کی نفی کر رہا ہے، یہاں نفی و اثبات کا اجتماع اس پہلوکو بھی اُجاگر کر دیتا ہے کہ اِسلام صرف حق کے اثبات کا ہی نہیں بلکہ ہر باطل کی نفی کا بھی نام ہے اور یہی تصور دراصل اِسلام کے انقلابی فلسفے کی بنیاد ہے۔ لفظ اللہ کی اصل کے بارے میں امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں:

أصله اِلٰه فحذفت همزته وادخل عليها الالف واللام فخص بالباری تعالیٰ.(۱)

''اس کی اصل الٰہ ہے۔ جس کے ہمزہ 'ء' کو حذف کر دیا گیا اور اِس پر ال داخل کر کے اِسے ذاتِ باری کے لئے خاص کر دیا گیا ہے۔''

اِشتقاقی مادہ کے لحاظ سے لفظ اللہ کے معانی

لفظ اللہ کے بارے میں یہاں مختصراً ضروری اُمور بیان کئے جاتے ہیں۔

لفظ اللہ کا مادہ 'الٰہ' ہے یعنی ال ہ لہٰذا اس مادہ کے بنیادی معنی درج ذیل ہیں:

گھبرا کر اور پریشان ہو کر کسی کی پناہ ڈھوڑنا یا پناہ دینا۔ متحیر ہونا اور ہر حوالے سے حیرت میں پڑ جانا۔ بلند مرتبہ ہونا اور نگاہوں سے پوشیدہ ہونا۔ کسی کی غلامی اور محکومیت اختیار کرنا۔ اِن معانی کی رُو سے اللہ تعالیٰ سے مراد وہ بلند و بالا ہستی ہے جو اِنسانی نگاہوں سے پنہاں ہے۔ جس کی عظمتوں کے شعور و ادراک سے اِنسانی عقول متحیر رہ جاتے ہیں اور جس کا غلبہ و اقتدار تمام کائنات پر چھایا ہوا ہے۔ اِس کو الٰہ تسلیم کرنے سے مراد یہ ہے کہ اِس کی اطاعت اور بندگی اختیار کی جائے۔

لفظ اللہ اُس کا اِسم ذات ہے اور یہی اسم اعظم ہے اور تمام اسمائے ربانی کے لئے یہ اِسم جامع ہے۔ بعض کے نزدیک یہ 'الٰہ' سے مشتق نہیں ہے۔ اس حوالے سے دلیل

(۱) راغب اصفهانی، المفردات: ۸۲

یہ دی جاتی ہے کہ الہ تو غیر اللہ معبود پر بولا جاتا تھا۔ اِسلام اور اِس سے پہلے کبھی بھی یہ معبودان باطلہ پر نہیں بولا گیا اور نہ ''الالہ'' کا مخفف ہے۔ عربی کے سوا کسی دوسری زبان میں اللہ کا اسم موجود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہمارا تعلق اس کی کتاب قرآن حکیم اور اُس کے رسول ﷺ کے ذریعے سے ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ساتھ ہمارے تعلق کی کوئی اور صورت موجود نہیں ہے۔ اللہ کی اطاعت کا مفہوم بھی یہی ہے کہ قرآن حکیم کے قوانین و احکام اور اُس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کی اطاعت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کو پکارنے کے معنی بھی یہی ہیں کہ زندگی کے ہر دوراہے پر اس کی دی ہوئی راہنمائی یعنی قرآن حکیم اور اُس کے رسول ﷺ ہی سے دریافت کیا جائے کہ ہم کس راستے پر چل کر فوز وفلاح حاصل کر سکتے ہیں۔ اس اللہ ہی کے حوالے سے الہ بھی ہے اور یہ ''لا الہ الا اللہ'' میں یہی معنی دیتا ہے کہ دنیا میں اُس کے رسول کے بغیر کوئی ہستی ایسی نہیں جس کے احکام و قوانین کی اطاعت کی جائے، جس کی محکومیت اختیار کی جائے، یہ اختیار اور حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ اطاعت و محکومیت صرف اُس کے قوانین ہی کی اختیار کی جائے گی اور یہی اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ہے اور یہی دین کا اصل الاصول اور اِسلام کی اساس و بنیاد ہے۔ قرآن حکیم میں کئی مقامات پر یوں بھی آیا ہے کہ 'اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے' اور پھر 'اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی الہ نہیں ہے' اس کے علاوہ یوں بھی ہے کہ 'اللہ کے سوا کسی کو الہ مت پکارو۔''

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات بابرکات کو بڑی وضاحت کے ساتھ اور کئی حوالوں کے ساتھ بیان فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کے بارے میں میں بتایا گیا ہے کہ:

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ. (۱)

''اُس کے مانند کوئی چیز نہیں ہے۔''

دوسرے مقام پر بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو

(۱) الشوری، ۴۲: ۱۱

انسانی صفات پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ ارشادِ ربّانی ہے:

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ○[1]

’’نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ سب نگاہوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اور وہ بڑا باریک بین بڑا باخبر ہے ○‘‘

انسانی آنکھ اُس کا ادراک نہیں کر سکتی۔ اس کی مثل بھی کوئی نہیں، اس لئے ذات الٰہی کو کسی مثال سے بھی نہیں سمجھایا جا سکتا۔ اللہ احد ہے، صمد ہے، نہ وہ بذریعہ تولید وجود میں آیا ہے نہ کوئی اس سے بذریعہ تولید وجود میں آتا ہے، اس کی مثیل و نظیر کوئی نہیں۔ وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ وہ اپنی مخلوق کا ہر وقت علم رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو اکیلا ہے اور اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ○[2]

’’فرما دیجئے: بس معبود تو وہی ایک ہی ہے اور میں ان (سب) چیزوں سے بیزار ہوں جنہیں تم (اللہ کا) شریک ٹھہراتے ہو ○‘‘

ارشاد باری تعالی ہے:

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ.[3]

’’جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اللہ ہی کا ہے۔‘‘

(۱) الانعام، ٦: ١٠٣
(۲) الأنعام، ٦: ١٩
(۳) النساء، ۴: ١٣١

صفاتِ خداوندی اور کائناتی نظام

اللہ تعالیٰ وہ ہے جو زندہ ہے جسے موت نہیں۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اللہ کی عبادت کو خالص کر کے اسی کو پکارو۔ ہر طرح کی تعریف اسی کو سزاوار ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ مزید ارشاد باری تعالیٰ یوں ہے کہ ''وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے، وہ پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے، وہ بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔'' اللہ تعالیٰ وہ ذات پاک ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے، وہ وحدہٗ لاشریک ہے جس کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ یہ لاشریک نہ ہو تو شاید اس کی طاقت پر دشمن کی کوئی طاقت غالب آجائے۔ اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی خدائی معرضِ خطرہ میں رہے گی، اسی حوالے سے یہ فرمایا ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وحدہٗ لاشریک ہونے کا بڑا ہی واضح مطلب ہے کہ وہ ایسا اللہ کامل ہے جس کی صفات اور خوبیاں اور کمالات ایسے اعلیٰ اور بلند ہیں کہ اگر موجودات میں سے بوجہ صفات کاملہ کے ایک خدا انتخاب کرنا چاہیں یا دل میں عمدہ سے عمدہ اور اعلیٰ سے اعلیٰ اللہ کی صفات فرض کریں تو وہ سب سے اعلیٰ جس سے بڑھ کر کوئی اور اعلیٰ نہیں ہوسکتا۔ وہی اللہ ہے سب ادنیٰ و اعلیٰ اسی کی عبادت بلا شرکت غیرے کرتے ہیں بلکہ اس کی عبادت میں بھی کسی کو شریک ٹھہرانا ظلم ہے۔ پھر فرمایا کہ عالم الغیب ہے، یعنی اپنی ذات کو وہ خود آپ ہی جانتا ہے، اس کی ذات پر کوئی احاطہ نہیں کرسکتا۔ ہم گویا آفتاب اور ماہتاب اور ہر ایک مخلوق کا سراپا دیکھ سکتے ہیں، مگر خدا کا سراپا دیکھنے سے قاصر ہیں۔ پھر اسی اللہ تعالیٰ کے بارے میں قرآن حکیم ہی میں فرمایا گیا ہے کہ وہ عالم الشہادۃ ہے، یعنی کوئی چیز اس کی نظر سے پردہ میں نہیں ہے۔ یہ جائز نہیں کہ وہ اللہ کہلا کر پھر علم اشیاء سے غافل ہو۔ وہ اس عالم کے ذرہ ذرہ پر اپنی نظر رکھتا ہے لیکن انسان اس طرح سے نظر نہیں رکھ سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ کب اس نظام کو توڑ دے گا اور قیامت برپا کر دے گا اور اس کے سوا کوئی اور اِس کی اجازت کے بغیر نہیں جانتا کہ ایسا کب ہوگا؟ سو وہی اللہ تعالیٰ ہے جو ان تمام وقتوں کو مستقلاً جانتا ہے۔

وہ اللہ تعالیٰ جانداروں کے لئے محض اپنے لطف و کرم سے نہ کسی غرض سے اور نہ کسی کے عمل کی پاداش میں ان کے لیے سامان راحت میسر کرتا ہے۔ جیسا کہ آفتاب اور زمین اور دوسری تمام چیزوں کو ہمارے وجود اور ہمارے اعمال کے وجود سے پہلے ہی ہمارے لیے بنا رکھا گیا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نیک عملوں کی نیک تر جزا دیتا ہے اور کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا اور ہر ایک چیز کی جزا وہ اپنے ہاتھ میں اور اپنے اختیار میں رکھتا ہے، اس کا کوئی ایسا کار پرداز نہیں جس کو اس نے زمین اور آسمان کی حکومت سونپ دی ہو اور وہ خود الگ تھلگ ہو کر بیٹھا ہو اور آپ خود وہ کچھ نہ کرتا ہو وہی کار پرداز سب کچھ جزا سزا دیتا ہو یا آئندہ دینے والا ہو۔ اللہ تعالیٰ ایک بے عیب بادشاہ ہے۔ اس پر کوئی داغ اور عیب نہیں۔

ذاتِ واجب الوجود کو بادشاہوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا

یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی انسانی بادشاہت عیب سے خالی نہیں ہوتی اور نہ عیب سے خالی ہو سکتی ہے۔ اگر تمام رعیت جلاوطن ہو کر دوسرے ملک کی طرف بھاگ جائے تو پھر بادشاہی قائم نہیں رہ سکتی یا اگر تمام رعیت قحط زدہ ہو جائے تو نظام سلطنت کس طرح چل سکے گا اور اگر رعایا کے لوگ اس سے بحث شروع کر دیں کہ تجھ میں اور ہم سے زیادہ کیا ہے، تو وہ کون سی اپنی لیاقت ثابت کرے۔ پس اللہ تعالیٰ کی بادشاہی ایسی نہیں ہے۔ وہ تو ایک دم میں تمام ملک کو فنا کر کے اور نئی مخلوقات پیدا کر سکتا ہے۔ اگر وہ اللہ ایسا خالق اور قادر نہ ہوتا تو پھر بجز ظلم کے اس کی بادشاہت چل نہ سکتی۔ کیونکہ وہ دنیا کو ایک مرتبہ معافی اور نجات دے کر پھر دوسری دنیا کہاں سے لاتا۔ کیا وہ نجات یافتہ لوگوں کو دنیا میں بھیجنے کے لئے پھر پکڑتا اور ظلم کی راہ سے اپنی معافی اور نجات وہی کو واپس لیتا، تو اس صورت میں اس کی خدائی میں فرق آتا اور دنیا کے بادشاہوں کی طرح ایک داغدار بادشاہ ہوتا۔ عام قانون شاہی میں یہ جائز ہے کہ ایک جہاز کو بچانے کے لئے دوسری کشتی کے سواروں کو تباہی میں ڈال دیا جائے اور انہیں ہلاک کر دیا جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو تو یہ اضطرار پیش نہیں آتا۔ بلکہ اُس کا قانون تو تمام قدرتوں کے ساتھ سچے انصاف پر چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ

معبودِ حقیقی ہے اس کی خدائی میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ یہ ساری خدائی پوری کی پوری بلاشرکت غیرے اس ذات کی ہے جو کسی کی بخشی ہوئی زندگی سے نہیں بلکہ آپ اپنی حیات سے زندہ ہے۔ ''اسی اللہ کے بل بوتے پر کائنات کا یہ سارا نظام قائم ہے۔ اپنی سلطنت میں خداوندی کے جملہ اختیارات کا مالک وہ خود ہی ہے۔ کوئی دوسرا نہ اس کی صفات میں اس کا شریک ہے نہ اس کے اختیارات میں اور نہ اس کے حق میں۔'' اللہ تعالیٰ کی حاکمیت غیر محدود ہے اور اسی طرح اللہ کے اختیارات بھی غیر محدود ہی ہیں۔ ''اس کی حکومت میں نہ تو کوئی بالاستقلال شریک ہے اور نہ کسی کا اس کے ہاں زور چلتا ہے کہ وہ اپنی سفارشوں سے اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے نہ کوئی دوسرا اللہ تعالیٰ کے کام میں دخل دے سکتا ہے۔ جبکہ کسی دوسرے کے پاس وہ ذاتی علم ہی نہیں ہے جس سے وہ نظام کائنات اور اس کی مصلحتوں کو سمجھ سکتا ہو۔ انسان ہوں یا جن یا فرشتے یا دوسری مخلوقات سب کا علم ناقص اور محدود ہے۔ کائنات کی تمام حقیقتوں پر کسی کی نظر بھی محیط نہیں۔ پھر اگر کسی چھوٹے سے چھوٹے جز میں بھی کسی بندے کی آزادانہ مداخلت یا اٹل سفارش چل سکے تو سارا نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے۔ نظام عالم تو رہا درکنار انسان تو خود اپنی ذاتی مصلحتوں کو بھی سمجھنے کے اہل نہیں ہیں۔ ان کی مصلحتوں کو بھی خداوند عالم ہی پوری طرح جانتا ہے اور ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس خدا کی ہدایت و رہنمائی پر اعتماد کریں، جو علم کا اصلی سرچشمہ ہے۔'' قانون فطرت کے تحت اس کائنات یا ماورائے کائنات جو کچھ بھی واقع ہو رہا ہے یا ہوتا رہتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہے۔ ہر طرح کا ''قانون بنانے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے اور جو نتائج اس قانون کے تحت رونما ہوتے ہیں وہ سب حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے اذن و ارادہ کے تحت ہی رونما ہوا کرتے ہیں۔'' اللہ تعالیٰ کی لاتعداد نشانیاں ہیں اور اس کی ان تمام نشانیوں سے بھی اظہار حق اور شعور و ادراک حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ ساری نشانیاں انسان کے اپنے نفس اور ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں اور یہ ساری نشانیاں ایک ہی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ یعنی یہ کہ موجودات عالم میں اللہ تعالیٰ صرف ایک ہے، باقی سب بندے ہیں۔ پھر جو شخص ان تمام

نشانیوں کے مقابلہ میں کسی حقیقی شہادت کسی علم، کسی مشاہدے اور کسی تجربے کے بغیر مجرد قیاس و گمان یا تقلیدِ آبائی کی بنا پر دوسروں کو الوہیت کی صفات سے متصف اور خداوندی حقوق کا مستحق ٹھہراتا ہے۔ تو اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں ہوسکتا۔

ایمان باللہ کا صحیح مفہوم

اللہ تعالیٰ پر بندے کے صحیح ایمان کے معنی ہی یہی ہیں کہ ایک ایسی ذات کو مانا جائے کہ جس کے اندر وہ تمام صفات موجود ہوں کہ جن کا ذکر آیۃ الکرسی میں کیا گیا ہے۔ اور اس حوالے سے اگر بغور دیکھا جائے تو شروع سے اخیر تک پورا قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کے ذکر پر ہی مشتمل ہے اور اس کا بہترین شاہکار آیۃ الکرسی ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام عیبوں اور مصائب اور سختیوں سے محفوظ ہے بلکہ وہ تو سلامتی دینے والا ہے۔ اس کے معنی بھی ظاہر ہیں کہ اگر وہ آپ ہی مصیبتوں میں پڑتا تو وہ لوگوں کے ہاتھوں سے مارا جاتا اور اپنے ارادوں میں ناکام رہتا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ باقی باطل معبودوں کے بارے میں بھی قرآن حکیم میں یوں ہے کہ:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ط اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ط وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ط ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ○ (۱)

’’اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے سو اسے غور سے سنو: بیشک جن (بتوں) کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو وہ ہرگز ایک مکھی (بھی) پیدا نہیں کرسکتے اگرچہ وہ سب اس (کام) کے لئے جمع ہو جائیں، اور اگر ان سے مکھی کوئی چیز چھین کر لے جائے (تو) وہ اس چیز کو اس (مکھی) سے چھڑا (بھی) نہیں سکتے، کتنا بے بس ہے طالب (عابد) بھی اور مطلوب (معبود) بھی○‘‘

(۱) الحج، ۲۲: ۷۳

اللہ تعالیٰ ایک عظیم تر ایک بزرگ تر اور وحدہ لاشریک ہستی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمانوں اور ان کے درمیان لاتعداد مخلوقات پیدا کر رکھی ہیں، ان مخلوقات میں انسان تو صرف انہی سے آگاہ ہے جو اس کے حواس خمسہ کے حوالے سے اس کے فہم و ادراک میں آتی ہیں، بہرصورت اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کی کوئی حد اور کوئی شمار نہیں ہے۔ لیکن واحد ایک اللہ ہی ان سب کا مالک، خالق اور رازق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنی تمام مخلوقات پر تصرف کلی ہے اور اللہ تعالیٰ سب پر غالب ہے اور سب پر محیط ہے۔ ہر طرح کے تمام اختیارات اور ہر طرح کا اقتدار محض اسی اللہ ہی کو حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اختیارات و اقتدار کی کرسی بڑی وسیع اور ہر شے پر غالب اور محیط ہے کوئی شے اور کوئی مقام اور جگہ اللہ تعالیٰ کی بادشاہت اور اس کی دسترس سے باہر نہیں ہے، پھر اللہ تعالیٰ ہی اپنی مخلوقات میں سے جسے چاہتا ہے جو دے دیتا ہے اور جس سے چاہے جو چھین لیتا ہے، اپنے اس اقتدار و اختیار میں اسے کسی صلاح کار، مشیر یا نائب کی ضرورت نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ ہی قضا و قدر کا موجب، باعث اور قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی ہر ایک کا ملجا و ماویٰ ہے اور اللہ تعالیٰ کی نگاہ دوربین سے کوئی بھی شے کہیں بھی مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے بلکہ کوئی بھی شے اللہ تبارک وتعالیٰ کی خبرگیری کے بغیر نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ اگرچہ انسان کے کسی بھی حواس یا تمام حواس سے حسی طور پر ادراک وشعور میں آنے سے ماورا اور مبرا ہے، اسے دیکھا، چھوا، چکھا، سونگھا نہیں جا سکتا لیکن اس کے باوجود بھی وہ اللہ بحوالہ قرآن حکیم ''ہم اُس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔''

فرمان الٰہی ہے:

نَحْنُ اَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ○(۱)

''ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں○''

(۱) ق، ۵۰: ۱۶

قُربتِ خداوندی کا معنٰی

اس قرابت کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے دل سے اس کی وریدوں سے بھی زیادہ قریب ہے اور اس کی روح سے، اس کی حیات سے بھی زیادہ قریب ہے، اس کی نظر اس کی آنکھ سے اتنی قریب نہیں جتنا اللہ تعالیٰ اس کے قریب ہے، اس کا لعاب دہن اتنا قریب نہیں جتنا کہ حق تعالیٰ اس سے قریب ہے۔ خالق کی مخلوق کے ساتھ اس قدر زیادہ قربت کوئی یوں ہی بے معنی نہیں ہے بلکہ اس قرابت کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ بندے کے اعمال کی حفاظت کی جائے، اس حوالے سے جہاں آسمان اور زمین وغیرہ کی پیدائش کا ذکر ہے تو اس میں انسان کی پیدائش اور اس کے ساتھ ہی اس کے اعمال کی حفاظت کا ذکر بھی موجود ہے۔ اس سلسلے میں ارشاد باری تعالیٰ یوں ہے کہ ''اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے ہر انسان کے لیے بصیرت ہے اور نصیحت ہے۔'' گویا یہ رجوع سوجھانے اور یاد دلانے کے لئے بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ہر مخلوق سے بخوبی باخبر اور واقف ہے۔ اسی حوالے سے اللہ تعالیٰ کو نہ صرف انسان کے اعمال کا ہی علم ہے بلکہ ان برے خیالات کا بھی علم ہوتا ہے جو اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور برے خیالات کا ذکر بالخصوص اس لیے کیا کہ شریروں کی سزا کا بھی خصوصیت سے ذکر موجود ہے اور پھر یہ بھی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو خالق فطرت انسانی ہے وہی اس کی اندرونی بیماریوں اور وساوس سے بھی باخبر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ سب اسی پر بھروسہ کرتے ہیں اور اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ پر یقین رکھنا ہی اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا ہے اور وہی اپنے بندوں کی دعائیں سنتا اور انہیں قبولیت بخشتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں پر ماں باپ سے بھی زیادہ مہربان ہے۔ انسان کے شعور و ادراک کو جو یہ بصیرت اور غور و فکر کی روشنی میسر آتی ہے یہ ساری دراصل نورِ حق ہی سے ملتی ہے اور اسی نورِ حق ہی کی بدولت انسانی عقل، عقلی دلائل پیدا کرنے میں بہت قوی اور شوخ ہو جاتی ہے اور نتیجتاً انسان غلطی کرنے سے بچ جاتا ہے۔ اس ظاہری اکتساب نور یا فیض نورِ حق

کے ساتھ ساتھ انسان روحانی طور پر بھی بدستور مستنیر ہوتا رہتا ہے۔ یوں وہ مادی دنیا کے ساتھ ساتھ روحانی دنیا میں بھی ہمہ وقت ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔اسی مادی اور روحانی ترقی کے حوالے سے ایک دعا کو قرآن حکیم نے یوں بیان کیا ہے

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِo[1]

”اور انہی میں سے ایسے بھی ہیں جو عرض کرتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں (بھی) بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی سے نواز اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ o“

الغرض مادی اور روحانی ترقی کا راز معرفتِ خداوندی میں پوشیدہ ہے اور معرفتِ خداوندی کا قرآنی اور ایمانی معیار حضور سرورِ کونین ﷺ کی محبت اور آپ ﷺ کی اتباع میں ہے۔

(۱) البقرہ، ۲: ۲۰۱

اِلٰہ کا معنی

اِس کا معنی ہے ہر وہ ذات کہ جس کی پرستش کی جائے، چاہے وہ حق ہو یا باطل۔ اِس لئے قرآن حکیم میں یہ لفظ ''الٰہ'' باطل معبودوں کے لئے بھی اِستعمال ہوا ہے۔

لوگوں کے ہاں الٰہ (معبود) کی نسبت تین قسم کے تصورات پائے جاتے ہیں:

(۱) الٰہ حقیقی (۲) الٰہ وضعی (۳) الٰہ نفسی

۱۔ الٰہ حقیقی وہی ہے جو معبودِ برحق اللہ تعالیٰ ہے۔

۲۔ الٰہ وضعی تمام باطل الٰہ جن کی پرستش باطل مذاہب میں بطور معبودان باطلہ کی جاتی ہے۔

۳۔ الٰہ نفسی اپنی خواہشِ نفس کو الٰہ بنا لینا۔

ارشادِ ربانی ہے:

اَفَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰاهُ.(۱)

''کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے۔''

حضور سرور کائنات ﷺ جب تشریف لائے تو مشرکین مکہ نے پتھر اور لکڑی کے سینکڑوں چھوٹے بڑے بتوں کو کعبۃ اللہ میں لٹکایا ہوا تھا اور اِن میں ہر بت ایک خاص قبیلے اور قوم کا ''الٰہ'' یعنی معبود تھا۔ مشرکین مکہ اِن بتوں کی عبادت کرتے اور اِن کے

(۱) الجاثیۃ، ۴۵: ۲۳

سامنے بندگی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا گیا کہ اِن جھوٹے اور خود ساختہ معبودانِ باطلہ کو ختم کر دیا جائے۔ اِس ناروا بندگی اور پرستش کو روک دیں اور عبادت وبندگی اُس معبودِ حقیقی سے مختص کر دیں جو ساری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ آپ ﷺ نے سعادت بخش اور نجات دینے والی دعوت کا آغاز کلمہ توحید کے اعلان کے ساتھ فرمایا اور برملا لوگوں سے کہا:

قولوا لا الٰہ إلّا اللہ تفلحوا.(۱)

’’کہہ دو اللہ کے سواء کوئی عبادت کے لائق نہیں تم کامیاب ہو جاؤ گے۔‘‘

تمام خود ساختہ اور جھوٹے خداؤں کو دل سے نکال دو اور اپنی زُبان کو لا اِلٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی صدائے حق سے آراستہ کرو اور دل سے اِس پر اعتقاد رکھو۔

یہ کلمہ ایمان اور اِسلام کی بنیاد کو درست کرتا ہے۔ اِس کلمہ پر دل سے ایمان لاتے ہی ایک کافر اور مشرک کفر و شرک کی نجاستوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ یہی وہ کلمہ ہے جو کافر و مومن اور مشرک و موحد کے درمیان امتیاز پیدا کرتا ہے۔

ذاتِ واجب کا تصور انسانی فطرت کی آواز ہے

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اعتراف فطرتِ انسانی کے اندرونی تقاضوں کا جواب ہے۔ تاریخِ انسانی میں ہمیں کوئی ایسا دور نہیں ملتا جب اِنسان اس بالاتر ہستی کے تصور سے نا آشنا رہا ہو۔ زمانہ قبل از تاریخ میں بھی تمام اِنسانوں میں یہ تصور اپنی فطری سادگی کے ساتھ موجود رہا۔ ہر دور کے انسان نے ہمیشہ اپنی تنہائیاں اسی اعلیٰ و بالا ہستی کے تصور سے آباد کیں۔ اِنسان نے اپنے دُکھوں اور تکلیفوں میں ہمیشہ اُسے پکارا۔

(۱) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۳: ۴۹۲، رقم: ۱۶۰۲۳
۲۔ طبرانی، المعجم الکبیر، ۵: ۶۱، رقم: ۴۵۸۲
۳۔ ابن أبی شیبۃ، المصنف، ۱۴: ۳۰۰، رقم: ۱۸۴۱۴

انسان کی اخلاقی و روحانی زندگی کا محور و مرکز ہمیشہ ذات واجب الوجود رہی۔ ذاتِ واجب الوجود کا تصوّر انسانی فطرت کی آواز ہے۔ انسان کے عقل و خرد کی دریافت نہیں۔ تاریخ اِنسانی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ قدیم ترین اِنسانی بستیوں کے باشندوں کا بنیادی تصور توحیدِ الٰہ کا تصور تھا۔ آسٹریلیا اور جزائر کے وحشی قبائل اور صحرائے گوبی سے نکلنے والے وہ قبائل جو ہندی، یورپی اور آریاؤں کے نام سے پکارے گئے اور صحرائے عرب کے قبائل جنہیں سامی کہا گیا اِن تمام کا بنیادی اور اساسی تصور عقیدہ توحید تھا۔ بہرصورت ایک یگانہ ہستی کا اعتراف تمام نوعِ انسانی کی اصل میراث ہے۔ اعتقادی و فکری خلفشار کے اسباب بعد میں رفتہ رفتہ پیکرِ محسوس کی خوگر یہ اقوام اپنے راستے سے بھٹکنے لگیں اور ان کے اندر یہ فکری خلفشار پیدا ہوئی کہ ہم ہر اُس کو مانیں گے جو محسوس کیا جا سکے یا انہیں عقل کی گرفت میں لایا جا سکے۔ اس لئے انہوں نے پروردگار عالم کے لئے بھی پیکر محسوس تراشتے ہوئے کہا کہ ہمارا پروردِگار وہ ہونا چاہیے جسے دیکھا، محسوس اور سمجھا جا سکے۔ اِسی نقطہ نظر سے شرک کی تمام آلودگیوں کے لئے راہ ہموار ہوئی۔ نتیجتاً نوعِ انسانی کبھی اصنام پرستی کا شکار ہوئی، کبھی اوہام پرستی میں مبتلا ہوئی، کبھی اس نے مظاہر فطرت کی پوجا کی اور کبھی طاقت کی مسند پر بیٹھنے والوں کو مظاہر فطرت کے اوتار اور دیوتاؤں کی صورت میں قبول کیا۔ اس صورتِ حال کی اصلاح کے لئے مختلف اوقات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا۔ انبیاء و رسل عظام علیہم السلام نے اِن اعتقادی گمراہوں کی اصلاح کرتے ہوئے یہ حقیقت واشگاف کی کہ خالق و مالک کی معرفت ایک مشکل بات سہی مگر جن لوگوں کو تم علم و معرفت کے حوالے سے، اخلاق و کردار کی بلندی کے حوالے سے، خدمات کے حوالے سے، انکشاف اور اکتشاف کے حوالے سے اور ایجاد و اختراع کے حوالے سے عظمت و بلندی کا مینار سمجھتے ہو، غور و فکر کرو کہ اِن کو جاننے اور سمجھنے کا طریقہ کیا ہے؟ کیا کسی بڑے اور عظیم انسان کو دیکھنے سے اِس کی حقیقی عظمت و بلندی نظر آجاتی ہے؟ کیا کسی موجب اور باعث و سبب کو دیکھنے سے اِس کی قوتِ ایجاد و اختراع دکھائی دے دیتی ہے؟ کیا کسی معمار اور کاریگر کو دیکھنے سے اس کا وہ جوہر اور کاریگری جو پتھر کو آئینے کی شکل و صورت دیتا ہے نظر آجاتا

ہے؟ کیا اگر تمہارے سامنے بقراط، سقراط اور افلاطون کو لا کھڑا کر دیا جائے یا وہ سب مجسم شکل و صورت میں تمہارے سامنے آ جائیں اور تم ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو تو کیا وہ جوہر اور کاریگری جس کی وجہ سے دنیا میں اُن کا نام مشہور ہے وہ تمہاری آنکھوں کے راستے سے تمہارے علم کا حصہ بن جائے گا؟ واضح سی بات ہے کہ وہ سارے لوگ اِنسانوں کی طرح انسان اور حقیقی عظمت اور معرفت کو کبھی نہ پاسکیں گے۔ کیونکہ ان کو جاننے، سمجھنے کا صحیح طریقہ انہیں دیکھنا نہیں بلکہ اِن کی صفات کو جاننا ہے۔ کاریگر اپنی کاری گری میں، معمار اپنی تعمیر میں، شاعر اپنی شاعری میں، ادیب اپنے ادب میں، فلسفی وحکیم اپنے فلسفہ و حکمت میں، مفکر و دانشور اپنی فکر و دانش میں اور خطیب اپنی خطابت میں نظر آتا ہے۔ یہ معرفت کا وہ صحیح طریقہ ہے جو حقیقی معرفت کا پتہ دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح تم اپنے خالق و مالک اور معبود حقیقی کی معرفت حاصل کرسکتے ہو۔

وہ خالق ہے اُسے صفتِ خلق میں دیکھو، وہ مالک ہے اُسے اُس کی ملک میں جانو، وہ رازق ہے اُسے رزق رسانی میں تلاش کرو، وہ رحیم ہے اُسے اُس کے رحم و کرم کے آئینے میں ڈھونڈو۔ اِس طرح تمہیں ہوا کا ایک جھونکا، پانی کی ایک بوند، روشنی کی ایک کرن، درخت کے پتے کی ایک ایک ڈالی اور پھولوں کی ایک ایک پنکھڑی یہاں تک کہ اِنسان کی اپنی ذات اللہ احکم الحاکمین کی خبر دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام کی تعلیم و ہدایت نے حواس اور خرد کی اِن پیدا کردہ غلطیوں اور گمراہیوں کا ازالہ کیا۔ انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت کا ایک بنیادی اُصول اور ضابطہ یہ رہا ہے کہ انہوں نے معرفتِ ربانی کی تعلیم ویسے ہی اُسلوب اور آہنگ میں دی جیسے اُسلوب وشکل کے فہم وتحمل کی اِستعداد اُن کے مخاطبین میں پیدا ہوگئی تھی۔ کیونکہ وہ انسانوں کے معلم و مربی تھے اور معلم کا فرض ہے کہ وہ اپنے متعلمین میں جس درجے کی فہم واستعداد پائی جائے اُسی درجہ کا سبق بھی دے۔

الغرض انبیاء و رسل عظام علیہم السلام نے وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ کی صفات کے لئے جو

پیرایہ تعلیم اختیار کیا اُس کے ظاہری قالب کو حقیقت جاننے کی وجہ سے آگے چل کر بعض لوگوں نے گمراہیوں کی نئی نئی شکلیں اختیار کر لیں۔ چنانچہ یہی فہم و استعداد کا فرق ہے جو ہمیں معرفتِ ربانی کے حوالے سے مختلف ادوار کی گمراہیوں میں نظر آتا ہے کہ وہ ذاتِ واجب کی صفات کا جو مرقع تیار کرتے ہیں اِس سے بنیادی کردار اِن کی ذہنی استعداد اور احوال وظروف کا ہوتا ہے۔ صفاتِ خداوندی کا تصور جو معرفتِ ذات کی شاہ کلید ہے۔ بد نصیبی سے اس میں بھی نوع بہ نوع اور مختلف قسم کی گمراہیاں در آئی ہیں۔ بعض اقوام نے صفات کو حواس کے آئینے میں دیکھا تو ذاتِ واجب کو مجسم شکل وصورت دے کر اَصنام پرستی تک پہنچ گئیں۔ بعض قوموں نے اِن صفات کو مستقل جانا تو بے شمار دیوتا اور اوتار بنا دیئے گئے۔ مثلاً عیسائیوں کا اقانیمِ ثلاثہ کا قائل ہوجانا اور اِس کو اپنے اعتقادات کا محور و مرکز بنا لینا۔ یہودیوں کا تورات میں خالقِ کائنات کو مجسم شکل میں دکھانا۔ یہ تمام ضلالت و گمراہیوں کی مختلف کڑیاں ہیں۔ توحید اور شرک کی صورتِ حال کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِنسان نے معرفتِ الٰہی میں باوجود اس کے اعتقاد رکھنے کے جو سب سے بڑی ٹھوکر کھائی وہ یہ تھی کہ ذاتِ واجب کو واسطۂ رسالت کے بغیر محض حواس کے ذریعے جاننا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے آخری کتاب قرآنِ حکیم میں واضح کر دیا کہ اُس کی صفات کے ذریعے معرفت حاصل کی جائے اور واسطۂ رسالت کے ذریعے ہی معرفت و قربتِ خداوندی کو حاصل کیا جائے۔

صفاتِ خداوندی کے بارے میں گمراہ اقوام کی افراط وتفریط

پھر فہم اِنسانی نے دوسری ٹھوکر یہ کھائی کہ اپنے فہم و استعداد کی نارسائی اور اثباتِ صفات میں غلو کے باعث ذاتِ واجب کے لئے پہلے تشبیہ اور پھر تجسیم کا سراپا تیار کر لیا تو قرآن حکیم نے اسے تنزیہ کا راستہ سکھایا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جن اقوام میں عقل وخرد اور فلسفیانہ علوم کا غلبہ ہوا انہوں نے تشبیہ سے بچنے کے لیے تنزیہ کا راستہ اختیار کیا مگر

چونکہ وحی الٰہی کو راہنما نہ بنایا نتیجتاً تعطیل کی وادی میں داخل ہو گئے۔

یہاں پر تنزیہ و تعطیل کا مفہوم ذہن نشین کر لینا از حد ضروری ہے۔ تنزیہ سے مقصود یہ ہے کہ جہاں تک عقل انسانی کے لئے ممکن ہے صفاتِ الٰہیہ کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک، اور بلند و بالا رکھا جائے۔ تعطیل کا مفہوم یہ ہے کہ تنزیہ کو اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ فکرِ انسانی کے تصور کے لئے کوئی بات باقی نہ رہے۔

تشبیہ اور تعطیل کے مابین اعتدال کا راستہ

اب قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ جس طرح اثباتِ صفات میں غلو، تشبیہ کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی طرح نفی صفات میں غلو تعطیل تک پہنچا دیتا ہے۔ اگر تشبیہ انسان کو حقیقت سے نا آشنا کر دیتی ہے تو تعطل اُسے عقیدہ کی روح سے محروم کر دیتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ افراط و تفریط دونوں سے اپنے دامن کو محفوظ رکھ کر تشبیہ و تعطیل دونوں کے درمیان راہ نکالی جائے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم نے جو راہ اختیار کی وہ دونوں راہوں کے درمیان جاتی ہے اور دونوں انتہاؤں کے میلان سے بچاتی ہوئی اعتدال عطا کرتی ہے۔

قرآنِ حکیم نے ایک طرف تو تنزیہ کو اس کے کمال درجہ تک پہنچایا اور دوسری طرف تعطیل سے بھی بچا لیا۔ قرآن حکیم فرداً فرداً تمام صفات و افعال کا اِثبات کرتا ہے۔ گو ساتھ ہی مشابہت کی بھی کلیتاً نفی کرتا جاتا ہے۔ قرآن حکیم کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ حسن و خوبی و کمال کی اُن تمام صفات سے جو انسانی ذہن و فکر میں آ سکتی ہیں متصف ہے۔

آیت الکرسی میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ وہ زندہ ہے، قدرت والا ہے، سب کچھ جاننے والا ہے اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ انسان کی بول چال میں قدرت و اختیار اور ارادہ و فعل کی جتنی شائستہ و شستہ تعبیرات ہیں انہیں بلا تامل استعمال کرتا ہے۔ مثلاً اللہ رب العزت کا ہاتھ تنگ نہیں:

بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ لا يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ. (۱)

’’بلکہ (حق یہ ہے کہ) اس کے دونوں ہاتھ (جودوسخا کے لئے) کشادہ ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ (یعنی بندوں پر عطا ئیں) فرماتا ہے‘‘

یعنی اُس کے تختِ حکومت و کبریائی کے احاطہ سے کوئی گوشہ باہر نہیں۔

وسع کرسیّہ السموات والارض کے لفظوں سے صاف اور بے لچک باور کرایا گیا ہے کہ اس سے مشابہہ کوئی چیز نہیں۔ پس ظاہر ہے کہ اُس کا زندہ ہونا ہمارے زندہ ہونے کی طرح نہیں ہوسکتا۔ اس کی پروردِگاری ہماری پروردگاری کی طرح نہیں ہو سکتی۔ اس کا دیکھنا، سننا، جاننا ویسا نہیں ہوسکتا جس طرح کے دیکھنے، سننے اور جاننے کا ہم تصور کر سکتے ہیں۔ اس کی قدرت و بخشش کا ہاتھ اور جلال واحاطہ کا عرش ضرور ہے لیکن یقیناً اس کا مطلب وہ نہیں ہو سکتا جو اِن الفاظ کے مدلولات سے ہمارے ذہنوں میں متشکل و متصور ہونے لگتا ہے۔ قرآن حکیم میں ’’لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ‘‘ اور ’’لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ‘‘ اور ’’فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ‘‘۔ جیسی آیات میں یہی سمجھایا گیا ہے۔

آیت الکرسی میں توحید کا ایجابی اور سلبی پہلو

آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کی معرفت کے لئے سلبی پہلو میں دو فقرے اور ایجابی پہلو میں آٹھ جملے آئے ہیں۔

ایجابی پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ یہ صفات ہیں، سلبی پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ یہ صفات نہیں ہیں۔ کیونکہ فلاسفہ بزورِ عقل معرفتِ خداوندی میں تنزیہ کی راہ پر اتنے دور نکل گئے کہ آخر انہیں سوائے عدمِ محض کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اِن تنزیہات کا سلسلہ جہاں جا کر ختم ہوا وہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ یہ نہیں، یہ بھی نہیں۔ تاہم انسان موجود ہے۔

(۱) المائدۃ، ۵: ۶۴

الغرض آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کی معرفت کے مثبت پہلو کو نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے۔ سلبی پہلو میں دو جملے اور ایجابی پہلو میں آٹھ جملے کہہ کر واضح کیا گیا ہے کہ صفات اللہ تعالیٰ کی شئون ہیں مگر ایسی نہیں کہ جن کا وہم و خیال اور ادراک کیا جا سکے۔ تنزیہ کے درجے میں اِتنی بات کافی ہے کہ اُس کی قیومیت پر کسی کمزوری کا داغ نہیں اور اُس کی شہنشاہیت ہر قسم کے عیب سے پاک ہے۔

www.MinhajBooks.com

اَلْحَیُّی کا معنی

آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کے لئے دوسری صفت ''حیات'' بیان کی گئی ہے۔ حیات سے ''حیّ'' ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نام ''الحیّ'' اس لئے ہے کہ وہ لوازمِ حیات، علم، قدرت، سمع و بصر اور ارادہ و کلام والا ہے۔ وہ حیاتِ ذاتیہ کا مالک ہے، اُسی نے ان کمالات کا مظاہر عالمِ ظہور میں دکھلایا ہے۔ اللہ تعالیٰ وہ معبودِ حقیقی اور بندگی و پرستش کے لائق ہے جو زندہ اور حیّ ہے۔ اس کا مطلب ہے زندہ، سدا رہنے والا، مدام زندگی والا، سب کو سنبھالنے والا، باعث حیات، موجب زیست۔ اسی سے انسانی زندگی ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے انسان کی موجودہ زندگی سلسلہ ارتقاء کی پہلی کڑی ہے۔ اس سطح پر اگر اس نے اپنے اندر آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کر لی تو پھر یہ سلسلہ مرنے کے بعد بھی اگلی کڑی پر فائز ہونے کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

حیات کیا ہے؟

حقیقی حیات محض روح کے پائے جانے سے وجود میں نہیں آتی بلکہ ایسی صفت کے پائے جانے سے وجود میں آتی ہے جو احساس، علم، قدرت اور ارادہ کا باعث بنے۔ چنانچہ ائمہ لغت و تفسیر اس کی تصریحات یوں کرتے ہیں۔

۱۔ علامہ سید محمود احمد آلوسیؒ فرماتے ہیں:

هي ما يصح بوجوده الإحساس أو معنى زائد على العلم والقدرة يوجب للموصوف به حالا لم يكن قبله من صحة العلم والقدرة. (۱)

(۱) آلوسی، روح المعانی، ۲۹: ۴

’’جس صفت کے پائے جانے سے احساس کا وجود صحیح قرار پائے یا جس کا وجود علم وقدرت کے وجود پر زائد ہو اور وہ اپنے موصوف کے لئے صحت علم وقدرت کے ایسے حال کو واجب کر دے جو اس سے پہلے نہ ہو۔‘‘

۲۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں:

هی صفة تستتبع العلم والقدرة والإرادة وغيرها من صفات الكمال. (۱)

’’وہ ایسی صفت ہے جس کے ساتھ علم، قدرت ارادہ وغیرہ تمام صفاتِ کمالیہ وابستہ ہیں۔‘‘

۳۔ علامہ نفسیؒ فرماتے ہیں:

ما يصح بوجوده الإحساس والموت ضده. (۲)

’’حیات وہ صفت ہے جس کے پائے جانے سے احساس کا وجود صحیح قرار پائے اور موت اس کی ضد ہے۔‘‘

۴۔ امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں:

الحياة تستعمل على اوجه الاول للقوة النامية، الثاينة للقوة الحاسة. (۳)

’’حیات کا استعمال کئی طرح سے ہے۔ اوّل قوت نامیہ (بڑھنے کی قوت) کے لئے، دوم قوت حاسہ کے لئے ہے۔‘‘

www.MinhajBooks.com

---

(۱) قاضی ثناء اللہ، تفسیر المظهری، ۱: ۱۸

(۲) نسفی، مدارك التنزيل، ۴: ۲۶۳

(۳) راغب اصفهانی، المفردات: ۱۳۸

۵۔ امام جلال الدین محلیؒ فرماتے ہیں:

الحیٰوۃ وھی ما به الإحساس والموت ضدھا أو عدمها. (۱)

''حیات صفت ہے جس کے ساتھ احساس ہو موت اس کی ضد ہے یا اس کا عدم۔''

۶۔ علامہ خازنؒ فرماتے ہیں:

ھي القوة الحاسة مع وجود الروح في الجسد وبه سمی الحیوان حیوانا. (۲)

''حیات ایسی قوت حاسہ کو کہتے ہیں جو بدن میں روح کے پائے جانے کے ساتھ پائی جائے۔ اسی وجہ سے حیوان کو حیوان کہتے ہیں۔''

۷۔ علامہ سید شریف جرجانیؒ فرماتے ہیں:

الحیاة ھي صفة توجب للموصوف بها أن یعلم ویقدر. (۳)

''حیات وہ صفت ہے جو موصوف کے لئے یہ لازم کرتی ہے کہ وہ علم اور قدرت رکھے۔''

ان تمام تعریفات کو پیش نظر رکھتے ہوئے معلوم ہوا کہ حیات ایسی صفت کا نام ہے جو احساس، علم، قدرت، ارادہ وغیرہ کا سبب ہو اور موت وہ حالت ہے جس میں یہ چیزیں نہ پائی جائیں۔

www.MinhajBooks.com

(۱) جلال الدین محلی، جلالین: ۵۶۳
(۲) خازن، لباب التأویل، ۷: ۱۰۳۔۱۰۴
(۳) شریف جرجانی، التعریفات: ۸۴

حیات کی کُنہ کو سمجھنا ناممکن ہے

زندگی کی کُنہ کو سمجھنا ناممکن ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ چند بے جان طبیعی عناصر اور معدنی نمکیات کو ایک مخصوص وزن اور خاص مقدار کے مطابق اِس کائنات کے خزائنِ طبیعی میں سے لے لیتا ہے اور پھر اپنے خاص قانونِ حیات کے مطابق انہیں زندہ موجودات میں تبدیل کر کے انہیں تحرّک حیات عطا کر دیتا ہے۔ انہیں طرح طرح کے اعمال و افعال بجا لانے کی صلاحیت اور قوت دے دیتا ہے۔ ایک زندہ وجود کے اندر اپنی خاص صورتوں اور شکلوں میں ہزاروں مرتبہ کیمیاوی عمل انجام پاتے ہیں اور مجموعی طور پر متابلیسم تیار کرتے رہتے ہیں۔

ان تمام کیمیاوی عوامل میں نہ صرف اعلیٰ درجے کی زمانی اور مکانی ہم آہنگی ہوتی ہے اور وہ اِس عمل میں بہم مربوط رہتے اور اجتماعی طور پر کام کرتے ہیں۔ بلکہ یہ سارا عمل ایسے منظّم طریقوں کے ساتھ انجام پذیر ہوتا ہے کہ پورے زندہ جسم کی حفاظت اور تعمیر ہوتی رہتی ہے اور وہ اپنے کمال کی طرف بڑھنے کی ہدایت پاتا رہتا ہے۔ مسئلہ حیات اِس عالم طبیعی کے اہم ترین اور پیچیدہ ترین مسائل میں سے ہے۔ مادی نقطہ نظر سے زندگی کی تحقیق کرنے والوں اور اُس کے طبیعی پہلو کا مشاہدہ کرنے والوں کا کہنا ہے کہ زندگی اُس توانائی کو کہتے ہیں جس کے نتیجہ میں ایک زندہ موجود غذا کھاتا ہے، ہضم کرتا ہے، جذب کرتا ہے اور خارج کرتا ہے اور خلئے بناتا ہے۔ تاکہ ایک طرف سے اس کے اندر سے تحلیل ہونے والے حصے کا بدل بن سکے اور دوسری طرف سے اِس زندہ موجود کے رُشد اور ترقی کا باعث بنے۔ معنوی نقطہ نظر سے زندگی کی تعبیر کرتے ہوئے محققین نے کہا کہ حیات ایک ایسی واقعیت ہے کہ جو بھی موجود اُس کو پالیتا ہے وہ علم، ادراک اور قدرت کا حامل بن جاتا ہے۔ اِن دونوں تعریفات پر اللہ تعالیٰ کی حیات کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

آیت الکرسی نے اپنے آغاز میں اللہ تعالیٰ کے معبود برحق ہونے اور لائق پرستش ہونے میں تنہا اور واحد بتایا ہے، بایں معنی کہ اس ذات الٰہی کے علاوہ کوئی بھی بندگی اور

عبادت کے لائق نہیں ہے۔ اس کے بعد اس معبودِ حقیقی کی صفات کمال یکے بعد دیگرے بیان کرنے شروع کی ہیں کہ جن میں سے اولین حیثیت حیات کو حاصل ہے کہ وہ ذات حیّ ہے۔ حیات کی مثال وجود کی سی ہے جس کا مفہوم واضح ہے، لیکن اس کی حقیقت نامعلوم ہے۔

مراتبِ حیات کیا ہیں؟

وجود کی طرح حیات بھی مختلف مراتب اور درجات رکھنے والی چیز ہے یعنی وہ غنی بالذات اور فقیر بالذات، واجب بالذات اور ممکن بالذات اور حیات ازلی و ابدی اور حیات حادث و فانی کے مدارج رکھتی ہے۔ گویا حیات کا اطلاق مختلف قوتوں پر ہوتا ہے، مثلاً قوتِ ناھیہ، قوت حساسہ، قوتِ عاملہ عاقلہ وغیرہ۔ یہ ساری حیات کی قسمیں فانی ہیں اور ان کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات پر نہیں ہوسکتا۔ حیّ ایک ایسا کلمہ ہے جس کا اطلاق باری تعالیٰ کی حیات پر بھی ہوتا ہے، جبکہ اس کی حیات اس کی عین ذات اور اس کی ذات سے قائم ہے۔ اگرچہ خود ذات حق تعالیٰ ہی حیات و زندگی کی اصل و بنیاد اور حقیقت حیات ہے، تاہم اسی کلمہ حيّ کا اطلاق ممکنات و مخلوقات کی حیات پر بھی ہوتا ہے حالانکہ ان کی حیات ان کی ذات سے زائد، جداگانہ اور اس کی عارض ہونے والی حقیقت ہے اور ان کی حیات کا قیام اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے، گویا حیّ کا اطلاق خالق و مخلوق ہر دو کی حیات پر ہوتا ہے۔ حیات و زندگی ایک حقیقی کمال ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات جو معبودِ حقیقی اور جمیع کمالات کی جامع ہے۔ اس کے لئے اس کمال حیات کا مالک ہونا از حد ضروری ہے۔ اگر بالفرض خداوند عالم کے لئے حیات ثابت اور متحقق نہ ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسے ممکنات جو صفت حیات سے متصف ہیں۔ وہ ہمارے خالق اور معبود برحق سے زیادہ کامل تر اور برتر ہو جائیں گے۔

مادہ پرستوں کے انکار کا جواب

زندگی ایک ایسی عجیب حقیقت ہے جو مادہ پرست لوگوں کے لئے ایک سنگین مشکل اور نا قابل توجہ شے بن کے رہ گئی ہے کیونکہ جب کسی بھی مادہ پرست فرد سے سوال کیا جائے کہ ایک مردہ اور بے شعور مادہ جو زندگی کے جوہر سے یکسر محروم تھا۔ اس کے لئے یہ کیسے ممکن ہو گیا کہ اس کے اندر زندگی پیدا ہو گئی؟ اس نے یہ عظیم نعمت کہاں سے اور کیسے حاصل کی ہے؟ تب وہ جواب میں چند ڈانواں ڈول باتیں پیش کر کے رہ جاتا ہے۔ وہ اس سوال کا کوئی قطعی اور معقول جواب نہیں دے سکتا اور نہ ہی اسے یہ قدرت حاصل ہوتی ہے کہ ظہور زندگی کے واقعہ کو کسی علمی اور منطقی انداز میں واضح اور روشن کر سکے، لیکن اِسلام کا پیروکار اور خالق لم یزل ولا یزال کو اس عالم کائنات کی بنیاد و اساس ماننے والا اس سوال کے جواب میں بول اُٹھتا ہے کہ ہر موجود کو وجود عطا کرنے والا خدا ہی ہے جو خود زندہ اور حیّ ہے اور ہر زندہ کو زندگی بخشنے والا ہے۔ جس طرح اس نے تمام موجودات کو خلعت وجود سے آراستہ فرمایا ہے اسی طرح ان کے لئے حیات کا فیض بھی جاری فرمایا ہے۔ یہ زندہ کائنات ایک زندہ خدا ہی سے وجود میں آئی ہے لیکن ہم لوگ اتنے عاجز ہیں کہ اس حیات و زندگی کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں اور ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اشیاء پر زندگی کا فیضان کیسے جاری فرمایا ہے۔ تاہم ایک مسلمان اس منطق سے آفرینش کی وضاحت کرتے ہوئے زندگی کے بارے میں کئے گئے سوال کا جواب دے سکتا ہے۔

آیت الکرسی خوابیدہ عقول کو بیدار کرنے والی ہے

اس سے پیشتر اشارہ ہوا کہ آیت الکرسی مشرکین کے خوابیدہ عقول کو بیدار کرنے اور انہیں شرک در عبادت سے نجات دلانے کے لئے نازل ہوئی ہے۔ اوّلین کلمہ جو عقل کے لئے غور کرنے کی بنیاد ہے، انہیں تفکر و تعقل پر مجبور کر دیتا ہے اور انہیں بت پرستی کی ذلت آمیز بندگی سے نجات بخشتا ہے وہ کلمہ ''حیّ'' ہے۔ آیت الکرسی اس کلمہ ''حیّ'' کے

ذریعے لوگوں کو یہ بات سمجھاتی ہے کہ وہ معبودِ حقیقی جو عبادت و پرستش کے لائق ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ صاحب حیات ہو۔ لٰہذا اے انسان! تو وہ ہے کہ جو اپنا راستہ گم کر بیٹھا ہے بت، آگ، سورج اور چاند جیسی بے جان اشیاء کی عبادت کرنے لگا ہے۔ اے اپنی بیش بہا شخصیت کو تباہ کرنے والے ! ذرا ہوش میں آ بیدار ہو کچھ سوچ کہ اس جہان میں تنہا تو ہی ایسا زندہ موجود ہے جو کامل فیض یافتہ اور ان تمام نباتاتی یا حیوانی موجودات کی نسبت برتر اور کامل تر ہے۔ صرف تو ہی وہ زندہ اور عاقل موجود ہے کہ جس کو خداوند عالم نے آزادی کی نعمت سے مالا مال کیا اور آزاد خلق فرمایا ہے۔ آیا عقل یہ اجازت دیتی ہے کہ ایک زندہ اور صاحب ادراک انسان جو اس جہان طبیعت میں شانِ کاملیت کی منازل طے کر چکا ہے اور اس کرۂ ارض کی اشرف ترین مخلوق ہے وہ پستی اور انحطاط کی راہ اپنائے! وہ اپنی عقل کو پیچھے چھوڑ دے، اس کی صدا پر کان نہ دھرے اور اپنی اس آزادی سے سوء استفادہ کرنے لگے جبکہ اس کے مقابل ایک جماداتی موجود جو عقل و حیات کی نعمت سے محروم ہے، بندگی کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکائے اور اس ذات کی عبودیت کا طوق اپنے ہاتھوں سے اپنی گردن میں ڈال لے۔ بڑی ہی افسوس ناک اور حیران و پریشان کرنے والی صورتِ حال ہے کہ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جا بجا قرآن حکیم میں روشنی ڈالی ہے۔

ارشادِ ربانی ہے:

قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ○ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ○[1]

”(ابراہیم علیہ السلام نے) فرمایا: کیا وہ تمہیں سنتے ہیں جب تم (ان کو) پکارتے ہو؟ ○ یا وہ تمہیں نفع پہنچاتے ہیں یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ ○“

(۱) الشعراء، ۲۶: ۷۲۔۷۳

عُقلا کے لئے دعوتِ فکر

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے شعور کو نئی زندگی بخشنے کے لئے اسی منطق سے استفادہ کیا اور ان بت پرست لوگوں سے فرمایا: جب تم ان بے جان بتوں کو پکارتے ہو تو کیا یہ تمہاری آواز سن لیتے ہیں! کیا یہ جماداتی موجودات اس اَمر پر قادر ہیں کہ زندگی کے قوانین پر اثر ڈالیں اور تمہیں کوئی فائدہ یا نقصان پہنچا سکیں!

بیشک اگر ایک بت پرست انسان اپنا اعمال نامہ عقل کی عدالت میں لے آئے اور اس قاضی خرد سے فیصلہ چاہے تو وہ قطعی طور پر اس کے اعمال نامے کو قابل مذمت قرار دے گا۔ منصف عقل اس کے احمقانہ عمل کو قبیح قرار دے گی اور اسے اس شرمناک بندگی اور بت پرستی کے نتیجے میں اس کی ذلت آمیز اسارت سے نجات دلانے کا حکم فرمائے گی اور حریت و آزادی کی طرف اس کی راہنمائی کرے گی۔ پس آیت الکرسی نے اپنے کلمہ (حیّ) کے ساتھ کہ جو معبود برحق کی ان صفات میں اوّلین صفت ہے جو اس آیت میں بیان کی گئی ہیں۔ یہ صفت بیان کر کے اس نے دیگر جمادی معبودوں کو اُلٰہیت کی کرسی سے نیچے اُتار پھینکا ہے اور ہر عاقل اور زندہ انسان کو ان بناوٹی خداؤں کی پرستش سے آزاد فرما دیا ہے۔

زندگی کی طرح موت بھی ایک حیرت انگیز حقیقت ہے

پوری کائنات میں اسی الحي القيوم اللہ تعالیٰ ہی کا نظام کارفرما ہے اور اس کے سوا اس کائنات میں کوئی صاحب اقتدار نہیں ہے۔ ارشاد ہوا ’’اللّٰہ لا الٰہ الا هو الحی القیوم‘‘، ’’اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ حیّ ہمیشہ رہنے والا ہمیشہ قائم دائم ہے۔‘‘ اس صفت سے یہ واضح ہوا کہ وہ معبودانِ باطلہ مثلاً بت، آگ، سورج اور چاند کی طرح جامد اور مردہ نہیں ہے۔ زندگی کی طرح موت بھی ایک حیرت انگیز حقیقت ہے۔ اِس جہانِ ہست و بُود کی تمام چیزیں وہ نباتات ہوں یا حیوانات وہ ابدی زندگی کے مالک

نہیں۔اس نظام کائنات میں ہر زندہ وجود عناصر کے باہمی تفاوت کے تحت اپنی ایک معین طبیعی زندگی لے کر آتا ہے۔ جونہی اُس کی زندگی کا دورانیہ مکمل ہوتا ہے، اُس کی طبیعی موت کا وقت آجاتا ہے اور اُس وقت وہ زندہ وجود مرجاتا ہے۔ زندہ وجود کے طبیعی عناصر اور اُس کے جسم کو تشکیل دینے والے تمام مواد کتابِ خلقت کے مقرر کردہ مخصوص نظام میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ یہ مسلسل تبدیلی اور پے درپے تغیر و تبدل قانون موت و حیات کا نتیجہ ہے اور اِس کا خالق و مالک خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کہ جس کی صفت الحیّ ہے۔

ارشادِ ربّانی ہے:

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ط وَ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ○(۱)

’’وُہی مُردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مُردہ کو نکالتا ہے اور زمین کو اس کی مُردنی کے بعد زندہ و شاداب فرماتا ہے اور تم (بھی) اسی طرح (قبروں سے) نکالے جاؤ گے○‘‘

دوسرے مقام پر موت و حیات کا فلسفہ اور اُس کی حکمتوں کو واضح کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً ط وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ○(۲)

’’جس نے موت اور زندگی کو (اِس لئے) پیدا فرمایا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل کے لحاظ سے بہتر ہے، اور وہ غالب ہے بڑا بخشنے والا ہے○‘‘

یہ ایک حقیقت ہے کہ حیات کی طرح موت بھی ایک مخلوق ہے اور اس نے بھی ایک دن مرنا ہے۔

---

(۱) الروم، ۳۰: ۱۹

(۲) الملک، ۶۷: ۲

عذابِ قبر

وہ آیات قرآنی جس میں عذاب قبر کا ذکر ہے ان میں سے چند ایک یہاں مذکور ہیں:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ○(۱)

''تم کس طرح اللہ کا انکار کرتے ہو حالاں کہ تم بے جان تھے اس نے تمہیں زندگی بخشی، پھر تمہیں موت سے ہمکنار کرے گا اور پھر تمہیں زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے○''

اس آیہ مبارکہ میں حسب ذیل نکات قابل غور ہیں:

کنتم امواتا (تم مردہ تھے): مردہ ہونے کا بظاہر یہ مفہوم ہے کہ کوئی چیز موجود ہو کر مر جائے مگر اس مقام پر انسانی زندگی کے عالمِ وجود میں آنے سے پہلے کی حالت کو تشبیہاً موت قرار دیا جا رہا ہے۔

فاحیاکم (پھر اس نے تم کو زندہ کیا): اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کو عدمِ محض سے نکال کر حالتِ وجود (existence) میں لا کھڑا کیا۔ مگر یہ سمجھنا حماقت ہوگی کہ یہ زندگی اس سلسلے کی آخری کڑی ہے۔

ثم یمیتکم (پھر وہ تمہیں دوبارہ مارے گا): جس خدا نے تم کو عالمِ عدم سے نکال کر عالمِ وجود میں پہنچایا ہے وہی تمہیں بارِ دیگر عالمِ عدم یعنی موت سے دو چار کرے گا۔ مگر یہ منزل بھی انسان کے سفر کی آخری منزل نہ ہوگی۔

ثم یحییکم (پھر وہ تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا): اگرچہ یہ زندگی جو دوسری

(۱) البقرۃ، ۲:۲۸

موت کے بعد انسان کو دی جائے گی، پہلی زندگی سے ماہیتاً اور احوالاً مختلف ہو گی مگر یہ بھی انسان کی آخری قرار گاہ نہ بننے پائے گی۔

ثم الیہ ترجعون (پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے): اس دوسری زندگی کے بعد انسان کو پھر دربارِ خداوندی میں حاضر کر دیا جائے گا۔

اس آیت میں دو موتوں اور زندگیوں کا اور پھر خدا کی بارگاہ میں پیش کیے جانے کا، یعنی کل پانچ مرحلوں کا ذکر ہے۔ جن سے انسان یکے بعد دیگرے گزرتا ہے۔ ایمان بالآخرت سے جس آخر کی زندگی پر ایمان مراد لیا جاتا ہے اس کی حقیقت سب سے آخر میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

ثُمَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ.

’’پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔‘‘

ترجعون: مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔ جس سے یہ تاثر دینا مقصود ہے کہ انسان خواہ مرنے کے بعد کی زندگی پر یقین رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، وہ کافر ہو یا مسلمان ہر شخص کو بہرحال خدا کے سامنے جواب دہی کے لئے پیش کر دیا جائے گا۔ البتہ فرق یہ ہے کہ مومن اور برگزیدہ افراد ہنسی خوشی اس طرف بڑھیں گے، ان کے لئے جانے میں کوئی پریشانی نہ ہو گی۔ مگر کافر اور بدکار اس سے دور بھاگنا چاہیں گے۔ ان کی خواہش ہو گی کہ ہم کسی طرح اس مرحلے سے بچ جائیں لیکن وہ کسی طور پر بھی اس زندگی کے نتائج و اثرات سے بچ نہ سکیں گے۔

www.MinhajBooks.com

دو موتیں

قرآنِ کریم نے دو موتوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک تو انسان کے سفرِ زندگی شروع کرنے سے پہلے کی حالت، حالتِ عدم ہے جبکہ دوسری موت سے مراد وہ حقیقی موت ہے جس کا نظارہ ہم اپنی روز مرہ زندگی میں کرتے ہیں۔

دو زندگیاں

جس طرح یکے بعد دیگرے انسان پر دو موتیں وارد ہوتی ہیں۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے انسان کو دو زندگیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ان میں پہلی زندگی تو واضح ہے کہ اس سے مراد عالمِ شہادت میں رنگ و کیف کی موجودہ زندگی ہے۔ یہ نور وظلمت اور ہست وبود کی زندگی ہے۔ مگر دوسری زندگی سے مراد قیامت کی زندگی نہیں بلکہ عالمِ برزخ یعنی مرنے سے لے کر قیامت تک کی زندگی ہے۔ جس کے دوران منکر نکیر کے سوال و جواب ہوتے ہیں اور انسان عذابِ قبر سے دو چار ہوتا ہے یا رحمت خداوندی کا مستحق ہوتا ہے۔ اس زندگی کا اصطلاحی نام ''حیاتِ برزخی'' ہے جبکہ اُخروی زندگی (آخرت) کا آغاز اس وقت سے ہو گا اس زندگی اور اس مادی کائنات کو کلیتًا فنا کر دیا جائے گا۔ پھر سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر وقوعِ قیامت تک جتنے بھی انسان اس دنیا میں آئے ہوں گے ان سب کو میدانِ حشر میں جمع کیا جائے گا اور وہ سب عدالتِ الٰہیہ میں حاضر ہو کر اپنے اعمال کا حساب و کتاب پیش کریں گے جس کے نتیجے میں یا تو وہ ابدی جنت کے مستحق ہوں گے یا جہنم کے سزاوار ٹھہرائے جائیں گے۔ حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ارشاد ہوتا ہے۔

عن أبي سعيد الخدري رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: يؤتى بالموت كهيئة كبش أملح فينادي مناد يا أهل الجنة! فيشرئبون وينظرون فيقول: هل تعرفون هذا؟ فيقولون: نعم هذا الموت وكلّهم قد رآه ثم ينادي يا أهل النّار فيشرئبون وينظرون فيقول: هل تعرفون هذا؟ فيقولون: نعم هذا الموت وكلهم قد رآه فيذبح ثم يقول: يا أهل الجنّة خلود فلا موت ويا أهل النّار خلود فلا موت ثم قرأ ﴿وَاَنْذِرْ هُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ﴾[1] وهؤلاء

(۱) مریم، ۱۹: ۳۹

في غفلة أهل الدّنيا ﴿وَهُمۡ لَا يُؤۡمِنُونَ﴾.(۱)

’’حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: موت کو (روزِ قیامت) ایک چتکبرے مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا۔ پھر ایک پکارنے والا پکارے گا کہ اے اہل جنت! وہ گردن اٹھا کر دیکھیں گے تو ان سے پوچھا جائے گا: کیا تم اس کو جانتے ہو؟ وہ کہیں گے: ہاں جانتے ہیں۔ یہ تو موت ہے۔ (وہ اس کو پہچان لیں گے) کیونکہ سب نے اسے دیکھا ہوگا۔ پھر پکارا جائے گا: اے اہل جہنم! وہ گردن اٹھا کر دیکھیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ کیا تم اسے جانتے ہو؟ وہ کہیں گے ہاں جانتے ہیں۔ یہ تو موت ہے (وہ اس کو پہچان لیں گے) کیونکہ سب اسے (مرتے وقت) دیکھ چکے ہوں گے۔ پھر اسے (موت کے مینڈھے کو) ذبح کر دیا جائے گا اور کہا جائے گا: اے اہل جنت! تم اس جنت میں ہمیشہ رہو گے اب کوئی موت نہیں ہوگی اور اے اہل جہنم! تم اس میں ہمیشہ رہو گے۔ اب کسی کو موت نہیں آئے گی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ’’اور آپ انہیں حسرت (و ندامت) کے دن سے ڈرایئے جب (ہر) بات کا فیصلہ کردیا جائے گا، مگر وہ غفلت (کی حالت) میں پڑے ہیں اور ایمان لاتے ہی نہیں۔‘‘ اور یہ اہلِ دنیا غفلت میں ہیں اور ایمان نہیں لاتے۔‘‘

(۱) ۱۔ بخاري، الصحيح، كتاب التفسير، باب قوله و انذرهم يوم الحسرة، ۴: ۱۷۶۰، رقم: ۴۴۵۳

۲۔ مسلم، الصحيح، كتاب الجنة و صفة نعيمها و أهلها، باب النار يدخلها الجبارون و الجنة يدخلها الضعفاء، ۴: ۲۱۸۸، رقم: ۲۸۴۹

۳۔ عبد بن حميد، المسند، ۱: ۲۸۶، رقم: ۹۱۴

۴۔ منذري، الترغيب و الترهيب، ۴: ۳۱۶، رقم: ۵۷۶۲

۵۔ بغوي، شرح السنة، ۱۵: ۱۹۸، رقم: ۴۳۶۶

حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اپنے جگر گوشہ سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں:

واعلم أن مالک الموت هو مالک الحیاة وأن الخالق هو الممیت.[1]

''جان لو کہ اس کائنات میں موت کا مالک اور اُس کا فرماں روا وہی ہے جو زندگی کا مالک ہے۔ وہی جس نے پیدا کیا ہے وہی موت دینے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ حکیم ہے جو عالم و قادر اور حیّ ہے کہ جس نے اپنے ارادے کے ساتھ اِس جہان کا نظام قائم کیا ہے۔ اُسی نے زندگی کو پیدا فرمایا ہے اور پھر زندہ اشیاء کو ایسی قوتوں اور توانائیوں سے آراستہ و پیراستہ فرمایا کہ جن کی اُنہیں اپنی زندگی کی بقا کے لئے سخت ضرورت لاحق رہتی ہے۔ حی و قیوم میں ''حی'' کے معنی زندہ کے ہیں اور قیوم کے معنی ہیں وہ ذات جو خود اپنے بل پر قائم اور سب کو قائم رکھنے والی اور سب کو سنبھالنے والی ہو۔ ظاہر ہے کہ جو خود زندہ نہ ہو وہ تمام دنیا جہان کے لئے زندگی بخش کس طرح ہوسکتا ہے اور جو خود اپنی ذات سے قائم نہ ہو، وہ آسمان و زمین کو قائم رکھنے والا کس طرح ہوسکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ ایک زندہ حقیقت ہے

اللہ تعالیٰ ایک زندہ خدا ہے۔ ایک زندہ خالق و مالک ہے تو ناگزیر ہے کہ وہ سب کچھ دیکھتا ہے، سنتا ہے، ہماری دعائیں اور فریادیں سنتا ہے۔ ہمارے اعمال و افعال اس کی نظر میں ہیں۔ اس سے یہ بات متحقق ہوتی ہے کہ وہ ہماری دعائیں اپنی حکمت کے مطابق قبول فرماتا ہے اور ہمارے اعمال پر ایک دن وہ جزا اور سزا بھی دے گا۔

اہلِ کتاب ''اللہ تعالیٰ کے زندہ خدا'' کی تعبیر سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ سابقہ انبیاء و رُسل عظام علیہم السلام کے صحیفوں میں بکثرت یہ تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ جہاں کہیں

(۱) شرح ابن الحدید: ۷۳

بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت، اس کے علم اور اس کی غیرت کا اظہار ہوا ہے بالعموم اس کے لیے ’’زندہ خدا‘‘ ہی کی تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ علاّم الغیوب سب کچھ جانتا ہے۔ جو اس کے سامنے ہے وہ حاضر و مستقبل میں ہے اور جو ان سے پیچھے گزشتہ اقوام و ملل کو پیش آیا اور پوری مخلوقات اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتی اور اللہ تعالیٰ نے یوں بھی ارشاد فرمایا:

وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ط وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًاo(۱)

’’اور (سب) چہرے اس ہمیشہ زندہ (اور) قائم رہنے والے (رب) کے حضور جھک جائیں گے، اور بیشک وہ شخص نامراد ہوگا جس نے ظلم کا بوجھ اٹھا لیاo‘‘

وہ حیّ لا یموت ہے۔ اس ضمن میں یوں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ط وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًاo(۲)

’’اور آپ اس (ہمیشہ) زندہ رہنے والے (رب) پر بھروسہ کیجئے جو کبھی نہیں مرے گا اور اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے رہئے اور اس کا اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر ہونا کافی ہےo‘‘

حمد و تسبیحِ الٰہی حصولِ صبر و توکل کا وسیلہ ہے

وہ زندہ خدا ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس پر بھروسہ کرنے والے کبھی محروم اور نامراد نہیں ہوتے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح حصولِ صبر و توکل کا وسیلہ ہے اور پھر اپنے ان مخالفین کا معاملہ اپنے رب کے حوالے کر دو۔ وہ ان کے تمام جرائم سے پوری طرح سے باخبر ہے اور جب وہ باخبر ہے تو ان کے ساتھ وہی سلوک کرے گا جس کے یہ سزاوار

(۱) طہ، ۲۰: ۱۱۱

(۲) الفرقان، ۲۵: ۵۸

ہیں۔ اللہ تعالیٰ ''الحی'' ہے اور اس کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ صرف وہی زندہ ہے اسی حوالے سے ارشادِ باری ہے:

هُوَ الْحَیُّ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ط اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○(۱)

''وہی زندہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پس تم اس کی عبادت اُس کے لئے طاعت و بندگی کو خالص رکھتے ہوئے کیا کرو، تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو سب جہانوں کا پروردگار ہے○''

حقیقی زندگی کا سرچشمہ ذاتِ واجب الوجود ہے

حقیقی زندہ اور زندگی بخشنے والا صرف وہی ہے۔ اس کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ جیسا کہ کئی دیگر مقامات پر بتایا گیا ہے کہ وہ زندگی سے محروم ہیں۔ ''أموات غیر احیاء'' زندگی سے محروم مردے ہیں۔ وہ نہ سنتے ہیں نہ کسی کی مدد کر سکتے ہیں۔ ان کو پکارنا بالکل لاحاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کو پکارو اور پورے اخلاص کے ساتھ اسی کی اطاعت کرو۔ اس لیے کہ شکر کا سزاوار اللہ ہی ہے جو تمام عالم کا رب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی درحقیقت الحيّ القیوم ہے۔ وہ زندہ ہے اور زندگی عطا کرنے والا ہے۔ اس کے سوا معبودانِ باطلہ کو ہرگز موت وحیات پر اختیار نہیں ہے۔ اس ضمن میں ارشادِ باری ہے:

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّهُمْ یُخْلَقُوْنَ وَلَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا یَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَیٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا○(۲)

''اور ان (مشرکین) نے اللہ کو چھوڑ کر اور معبود بنا لئے ہیں جو کوئی چیز بھی پیدا

(۱) المؤمن، ۴۰: ۶۵

(۲) الفرقان، ۲۵: ۳

www.MinhajBooks.com

نہیں کر سکتے بلکہ وہ خود پیدا کئے گئے ہیں اور نہ ہی وہ اپنے لئے کسی نقصان کے مالک ہیں اور نہ نفع کے اور نہ وہ موت کے مالک ہیں اور نہ حیات کے اور نہ (ہی مرنے کے بعد) اٹھا کر جمع کرنے کا (اختیار رکھتے ہیں)o‘‘

ان معبودانِ باطلہ کے برعکس اللہ تعالیٰ ہی ہے کہ جو اپنے قانون کے مطابق زندگی دیتا ہے اور موت طاری کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک خوبصورت انداز اس طرح سے ہے:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا نِ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ.(۱)

’’آپ فرمادیں اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول (بن کر آیا) ہوں جس کے لئے تمام آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی جلاتا اور مارتا ہے،‘‘

سورۃ الدخان میں اللہ تعالیٰ کی اسی صفت کو قدرے وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۘ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَo لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ط رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَo(۲)

’’آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ اِن کے درمیان ہے (اُس کا) پروردگار ہے، بشرطیکہ تم یقین رکھنے والے ہو۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی زندگی دیتا اور موت دیتا ہے (وہ) تمہارا (بھی) رب ہے اور تمہارے اگلے آبا و اجداد کا (بھی) رب ہےo‘‘

(۱) الأعراف، ۷: ۱۵۸

(۲) الدخان، ۴۴: ۷، ۸

گویا اللہ تعالیٰ ہی موت دیتا ہے اور وہی زندگی بخشتا ہے تو جب کسی دوسرے کو نہ موت کے معاملے میں کوئی دخل نہ زندگی کے معاملے میں کوئی اختیار، تو اس کے سوا کسی اور کو مولیٰ و مرجع بنانے کے کیا معنی؟ اسی اختیار اور قانون فطرت کے مطابق اقوام کی موت اور حیات بھی آتی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ افراد کی پیدائش اور پرورش اور موت پر قادر ہے۔ اسی طرح اقوام کی موت و حیات اللہ تعالیٰ کے انہی محکم قوانین سے وابستہ ہے۔ جو قوم ان قوانین کے مطابق عمل کرتی ہے زندہ رہتی ہے اور جو ان کی خلاف ورزی کرتی ہے تباہ ہو جاتی ہے۔ گویا ہر شے کو موت و حیات اللہ تعالیٰ کے قانون ہی کے مطابق ملتی ہے۔ ''اللہ الحیّ'' مردوں کو اپنے قانون کے مطابق زندگی عطا کرتا ہے ''انسان کہتا ہے کہ جب میں مر جاؤں گا تو زندہ کیسے قبر سے نکالا جاؤں گا۔'' اس کے جواب میں ارشاد باری تعالیٰ اس طرح سے ہوتا ہے:

اَوَلَا یَذْکُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ یَکُ شَیْئًا○(۱)

''کیا انسان یہ بات یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اس سے پہلے (بھی) اسے پیدا کیا تھا جبکہ وہ کوئی چیز ہی نہ تھا○''

اس طرح سے بھی اس الحی القیوم کا ارشاد ہے:

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّهٗ یُحْیِ الْمَوْتٰی وَ اَنَّهٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ○(۲)

''یہ (سب کچھ) اس لئے (ہوتا رہتا) ہے کہ اللہ ہی سچا (خالق اور رب) ہے اور بیشک وہی مُردوں (بے جان) کو زندہ (جاندار) کرتا ہے اور یقیناً وہی ہر چیز پر بڑا قادر ہے○''

---

(۱) مریم، ۱۹:۶۷

(۲) الحج، ۲۲:۶

اللہ تعالیٰ کس طرح مردہ ہو جانے والوں کو زندہ کرے گا، اس سلسلے میں قرآن حکیم میں متعدد آیات میں اس جانب واضح طور پر اشارہ کر دیا گیا ہے:

فَانْظُرْ اِلٰٓی اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ط اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰی ج وَ هُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ○ (۱)

’’سو آپ اللہ کی رحمت کے اثرات کی طرف دیکھئے کہ وہ کس طرح زمین کو اس کی مُردنی کے بعد زندہ فرما دیتا ہے، بیشک وہ مُردوں کو (بھی اسی طرح) ضرور زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے ○‘‘

سورہ یٰسین میں اس ضمن میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے:

اِنَّا نَحْنُ نُحْیِ الْمَوْتٰی وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ. (۲)

’’بیشک ہم ہی تو مُردوں کو زندہ کرتے ہیں اور ہم وہ سب کچھ لکھ رہے ہیں جو (اعمال) وہ آگے بھیج چکے ہیں۔‘‘

اور یوں بھی ارشاد فرمایا:

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلاً وَّ نَسِیَ خَلْقَهٗ ط قَالَ مَنْ يُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِيْمٌ ○ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ط وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُ ○ (۳)

’’اور (خود) ہمارے لئے مثالیں بیان کرنے لگا اور اپنی پیدائش (کی حقیقت) کو بھول گیا۔ کہنے لگا: ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا جبکہ وہ بوسیدہ ہو چکی ہوں گی؟ فرما دیجئے: انہیں وہی زندہ فرمائے گا جس نے انہیں پہلی بار پیدا کیا تھا، اور وہ ہر مخلوق کو خوب جاننے والا ہے ○‘‘

(۱) الروم، ۳۰: ۵۰

(۲) یٰسٓ، ۳۶: ۱۲

(۳) یٰسٓ، ۳۶: ۷۸۔ ۷۹

کیا ان کافروں اور نادانوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کارساز بنا رکھے ہیں۔ پس کارساز تو اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہی مردوں کو دوبارہ زندہ کرے گا اور اس کی قدرتِ کاملہ تمام اشیائے کائنات پر محیط ہے اور وہ اس پر قادر ہے کہ مردوں کو دوبارہ زندہ کر دے۔

اس دنیا میں زندگی ملنے سے پہلے کا عرصہ پہلی موت، پھر زندگی پھر دنیا کی زندگی کا خاتمہ یعنی موت اور اس کے بعد دوسری زندگی، اسی حوالے سے ارشاد الٰہی ہے کہ ''تم قانون خداوندی سے کیسے انکار کر سکتے ہو! تم مردہ تھے اس نے زندگی عطا کی، پھر مر جاؤ گے اور اس کے بعد پھر زندگی ملے گی۔'' ارشاد باری ہے:

قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ○ (۱)

''وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دوبار موت دی اور تو نے ہمیں دوبار (ہی) زندگی بخشی، سو (اب) ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں، پس کیا (عذاب سے بچ) نکلنے کی طرف کوئی راستہ ہے؟ ○''

ہر طرح کی زندگی کا اظہار الحيُّ کی صفت کا مرہونِ منت ہے

اور پھر یہ بھی ہے کہ موت کے بعد دنیا میں واپسی بھی نہیں ہوگی۔ اس ضمن میں سورۃ المومنون میں اور سورہ المنافقون میں بھی ارشاد الٰہی ہے کہ اللہ الحی کی یہ صفت زندگی کی نمود اور زندگی کی روانی اور پھر حیات بعد الممات پر پوری طرح سے حاوی ہے۔ ہر طرح کی زندگی کا اظہار اسی ''الحیّ'' کی صفت کا مرہون منت ہے اور جب اس میں روئیدگی آجاتی ہے تو گویا اسے حیات تازہ عطا کرنا قرار دیتا ہے۔ اسی طرح انسان پر جب طبیعی موت وارد ہوتی ہے اسے مردہ کہا جاتا ہے اور جب اسے دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو اسے حیات نو کہا گیا ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے موت کے بعد اس دنیا میں کوئی شخص واپس

(۱) المؤمن، ۴۰: ۱۱

نہیں آسکتا۔ اس لیے انسان کے لیے عمل کا صرف اسی دنیاوی زندگی ہی میں موقع ہے اور اسی زندگی کے اعمال کے مطابق اس کی مستقبل کی زندگی متشکل ہوتی ہے، اچھی بھی اور بری بھی۔ دوبارہ یہاں آنے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔

طبیعی موت انسان کے محض جسم پر وارد ہوتی ہے

قرآن حکیم کی رو سے طبیعی موت انسان کے جسم پر وارد ہوتی ہے لیکن انسانی ذات جو نہ قوانین طبیعی کی پیدا کردہ ہوتی ہے اور نہ ہی ان قوانین کے تابع ہوتی ہے۔ اس پر موت وارد نہیں ہوسکتی، قرآن حکیم نے اسے نفس کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے، لہٰذا انسان کی طبیعی موت کے بعد نفس انسانی آگے جاتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ **المحي** اور **الحي** ہے، اسی طرح وہ ''**المميت**'' بھی ہے۔ اپنی اس صفت کے حوالے سے وہ اپنے خاص قانون اور قاعدے کے مطابق وہی مارتا ہے اور وہی زندہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر آیا ہے کہ:

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ط وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ج وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ط وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ○[1]

''اور کوئی شخص اللہ کے حکم کے بغیر نہیں مر سکتا (اس کا) وقت لکھا ہوا ہے، اور جو شخص دنیا کا انعام چاہتا ہے ہم اسے اس میں سے دے دیتے ہیں، اور جو آخرت کا انعام چاہتا ہے ہم اسے اس میں سے دے دیتے ہیں، اور ہم عنقریب شکر گزاروں کو (خوب) صلہ دیں گے○''

پھر اس طرح ارشاد فرمایا:

وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ○[2]

(۱) آل عمران، ۳: ۱۴۵

(۲) آل عمران، ۳: ۱۵۶

''اور اللہ ہی زندہ رکھتا اور مارتا ہے، اور اللہ تمہارے اعمال خوب دیکھ رہا ہے ○''

ہر طرح کی زندگی اور موت وہی اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے اس سلسلے میں یوں ارشاد ہے:

هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ○(۱)

''وہی جلاتا اور مارتا ہے اور تم اسی کی طرف پلٹائے جاؤ گے ○''

اسی ضمن میں سورۃ الحجر میں یوں فرمایا گیا ہے:

وَ اِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُوْنَ○(۲)

''اور بیشک ہم ہی جلاتے ہیں اور مارتے ہیں اور ہم ہی (سب کے) وارث (و مالک) ہیں○''

اللہ تعالیٰ نے جو حیات وممات کا ایک بے پناہ نظام نافذ کر رکھا ہے، یہ یوں ہی نہیں ہے بلکہ اس میں بھی اس اللہ المحی اور الحی و الممیت نے غور وفکر کرنے والوں کے لیے مقاماتِ تفکر فراہم کیے ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَهُوَ الَّذِىْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ○(۳)

''اور وہی ہے جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے اور شب و روز کا گردش کرنا (بھی) اسی کے اختیار میں ہے۔ سو کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟''

یہ اللہ تعالیٰ ہی کا سارا وسیع وعریض نظام ہے اور ہر چیز کا اسی نے اہتمام کر رکھا ہے۔ اس سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

(۱) یونس، ۱۰: ۵۶
(۲) الحجر، ۱۵: ۲۳
(۳) المؤمنون، ۲۳: ۸۰

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ط هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ یَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَیْءٍ ط سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ○(۱)

’’اللہ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا پھر اس نے تمہیں رزق بخشا پھر تمہیں موت دیتا ہے پھر تمہیں زندہ فرمائے گا، کیا تمہارے (خود ساختہ) شریکوں میں سے کوئی ایسا ہے جو ان (کاموں) میں سے کچھ بھی کر سکے، وہ (اللہ) پاک ہے اور ان چیزوں سے برتر ہے جنہیں وہ (اس کا) شریک ٹھہراتے ہیں○‘‘

کائنات کی ہر چیز اُسی کے امرِ کن سے وجود میں آتی ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ○(۲)

’’اس کا امر (تخلیق) فقط یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کو (پیدا فرمانا) چاہتا ہے تو اسے فرماتا ہے ہو جا، پس وہ فوراً (موجود یا ظاہر) ہو جاتی ہے۔ (اور ہوتی چلی جاتی ہے)○‘‘

دوسرے مقام پر اس کو مزید وضاحت کے ساتھ یوں بیان کیا:

وَقَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ج وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ج اِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ○(۳)

’’اور وہ کہتے ہیں ہماری دنیوی زندگی کے سوا (اور) کچھ نہیں ہے ہم (بس) یہیں مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں زمانے کے (حالات و واقعات کے) سوا کوئی ہلاک نہیں کرتا (گویا خدا اور آخرت کا مکمل انکار کرتے ہیں) اور انہیں

(۱) الروم، ۳۰: ۴۰
(۲) یٰسٓ، ۳۶: ۸۲
(۳) الجاثیۃ، ۴۵: ۲۴

اس (حقیقت) کا کچھ بھی علم نہیں ہے وہ صرف خیال و گمان سے کام لے رہے ہیں○‘‘

پھر فرمایا:

قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ○(۱)

’’فرما دیجئے: اللہ ہی تمہیں زندگی دیتا ہے اور پھر وہی تمہیں موت دیتا ہے پھر تم سب کو قیامت کے دن کی طرف جمع فرمائے گا جس میں کوئی شک نہیں ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے○‘‘

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ○(۲)

’’بیشک ہم ہی زندہ رکھتے ہیں اور ہم ہی موت دیتے ہیں اور ہماری ہی طرف پلٹ کر آنا ہے○‘‘

اسی تناظر میں یوں بھی آیا ہے:

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ○(۳)

’’اسی کے لئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے، وہی جلاتا اور مارتا ہے، اور وہ ہر چیز پر بڑا قادر ہے○‘‘

www.MinhajBooks.com

(۱) الجاثیۃ، ۴۵: ۲۶

(۲) قٓ، ۵۰: ۴۳

(۳) الحدید، ۵۷: ۲

سلسلۂ کائنات ہمیشہ رہنے والا نہیں

جان لینا چاہیے کہ یہ سارا سلسلہ کائنات سدا رہنے والا نہیں ہے۔ یہ سارا سلسلہ کائنات ایک متعین مدت کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔ کوئی شخص سدا زندہ نہیں رہ سکتا، موت ہر ایک کو آئے گی۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر واضح طور پر بتا دیا گیا ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۚ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ○ (۱)

’’کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ رات کو دن میں داخل فرماتا ہے اور دن کو رات میں داخل فرماتا ہے اور (اسی نے) سورج اور چاند کو مسخّر کر رکھا ہے، ہر کوئی ایک مقرّر معیاد تک چل رہا ہے اور یہ کہ اللہ ان (تمام) کاموں سے جو تم کرتے ہو خبردار ہے○‘‘

اور بڑے ہی واشگاف الفاظ میں فرمایا گیا ہے کہ ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ. (۲)

’’(اے موت کے ڈر سے جہاد سے گریز کرنے والو) تم جہاں کہیں (بھی) ہو گے موت تمہیں (وہیں) آ پکڑے گی خواہ تم مضبوط قلعوں میں (ہی) ہو۔‘‘

اور اس طرح سے بھی موجود ہے:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۭ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۭ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ○ (۳)

(۱) لقمان، ۳۱: ۲۹

(۲) النساء، ۴: ۷۸

(۳) الأنبياء، ۲۱: ۳۵

’’ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے، اور ہم تمہیں برائی اور بھلائی میں آزمائش کے لئے مبتلا کرتے ہیں، اور تم ہماری ہی طرف پلٹائے جاؤ گےo‘‘

اور پھر سورۃ العنکبوت میں اس طرح سے ارشاد باری ہے:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَo(۱)

’’ہر جان موت کا مزہ چکھنے والی ہے، پھر تم ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گےo‘‘

سورۃ الجمعہ میں اس طرح سے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَo(۲)

’’فرما دیجئے: جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ ضرور تمہیں ملنے والی ہے پھر تم ہر پوشیدہ و ظاہر چیز کو جاننے والے (رب) کی طرف لوٹائے جاؤ گے سو وہ تمہیں آگاہ کر دے گا جو کچھ تم کرتے تھےo‘‘

اللہ تعالیٰ اپنے خاص نظام کے تحت مخلوقات کو موت سے ہمکنار کرتا ہے۔ گویا جس طرح وہ اللہ تعالیٰ زندگی دیتا ہے اسی طرح موت بھی وارد کرتا ہے۔ وہ مارنے والا ہے اللہ تعالیٰ ہی اجسام کو مارنے والا ہے اور اسی طرح دلوں کو غفلت اور نادانی سے مارتا ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی نفسانی خواہشات اور وسوسوں کو مارے اور الحیّ کی صفت سے اپنے آپ کو متصف کرتے ہوئے قلب و باطن کی حقیقی زندگی سے آراستہ کرے۔

www.MinhajBooks.com

(۱) العنکبوت، ۲۹:۵۷

(۲) الجمعۃ، ۶۲:۸

اَلْقَیُّوْمُ کے معانی و مطالب

''قیوم'' کا اصل مادہ ''ق و م'' ہے۔ ''قیوم'' مبالغہ کا وزن ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ ذات جو خود اپنے بل پر قائم ہو اور دوسروں کے قیام و بقا کا واسطہ اور ذریعہ ہو۔ اس کے معنی ہیں اعتدال اور توازن قائم ہونا۔ اسی نہج پر قام اور قیام کے معنی کھڑے ہونے کے ہیں۔ کھڑا وہی رہ سکتا ہے جس کا توازن قائم رہے۔

اَلْقَیُّوْمُ کا پہلا معنٰی

القیّوم کا پہلا معنی یہ ہوا کہ وہ خود قائم اور ہر چیز کا محافظ اور اس کو وہ اسباب عطا فرمانے والا جن کے ساتھ اس کا قیام ممکن ہے لہٰذا اس کے معنی میں دونوں باتیں شامل ہیں یعنی اپنی ذات میں قائم اور دوسروں کو قائم رکھنا۔ پھر قیوم کے دیگر معانی میں ہمیشہ قائم رہنے والا، ہر طرح کے حوادث اور خطرات سے محفوظ اور سدا قائم۔ ''قیوم'' کی صفت سابقہ انبیاء کے صحیفوں میں بار بار پہلے بھی مذکور ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قیوم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے اور اس کی قدرت سے قائم ہے۔ یہ صفت اللہ تعالیٰ کی بدیہی صفات میں سے ہے، جن پر عقلاً بھی ایمان لانا ضروری ہے اور نقلاً و شرعاً بھی۔ اللہ تعالیٰ کے قیوم ہونے کی صفت کا حوالہ اور دلیل یہ بھی ہے کہ وہ انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی بھی کرتا ہے، وہ اپنی خلق کو قائم رکھنے والا ہے اور اس کے لئے ہر قسم کے اسباب و وسائل بھی پیدا کرتا ہے اور قیومیت اس بات کی مقتضی ہے کہ خدائے قیوم و کارساز اس امر کی بھی نگرانی کرے کہ بندہ سرکشی اور بغاوت کا مرتکب نہ ہو۔ گویا اللہ تعالیٰ خود حق پر اور عدل پر قائم ہے اور دوسروں کو عدل و

حق پر قائم کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس ضمن میں قرآن حکیم میں کئی لطیف ارشادات موجود ہیں۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی یہ صفت تین بار اِستعمال ہوئی ہے اور الحیّ القیوم کی صورت میں آئی ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ. (۱)

''اللہ، اس کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں (وہ) ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے (سارے عالم کو اپنی تدبیر سے) قائم رکھنے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہے اور پوری مخلوقات اور کائنات اس کے علم کا احاطہ نہیں کرسکتی۔ ارشادِ ربّانی ہے:

وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ط وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ○ (۲)

''اور (سب) چہرے اس ہمیشہ زندہ (اور) قائم رہنے والے (رب) کے حضور جھک جائیں گے، اور بیشک وہ شخص نامراد ہوگا جس نے ظلم کا بوجھ اٹھا لیا ○''

خدا خاموش علت العلل نہیں ہے

مشرکین مکہ خدا کو تو مانتے تھے لیکن اپنے مشرکانہ عقائد کے تحت انہوں نے اپنے خدا کو بوڑھا اور ناکارہ خدا سمجھا ہوا تھا۔ لیکن قرآن حکیم ان کے زعم باطل پر ضرب لگاتا ہے اور فرماتا ہے کہ خدا کوئی ناکارہ وجود نہیں ہے بلکہ زندہ خدا ہے اور اپنی پیدا کی ہوئی اس دنیا کے سارے معاملات کو دوسروں کے اوپر نہیں چھوڑتا اور وہ کوئی خاموش علت العلل بن کر نہیں بیٹھا ہے بلکہ ''قیوم'' یعنی اس کائنات کے سارے نظم کو سنبھالے ہوئے ہے اور اس کو خود اپنی نگرانی اور اہتمام میں چلا رہا ہے۔ اس اِسم مبارک کے حوالے سے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے اللہ کے سوا سب سے بے نیاز ہو جائے اور اللہ کے بندوں کے

(۱) آل عمران، ۳: ۲
(۲) طٰہٰ، ۲۰: ۱۱۱

کام سنوارے۔ اللہ تعالیٰ کی زندگی ذاتی ہے اور اِس قسم کی زندگی نہیں ہے جس قسم کی مخلوقات کی ہے، اِس کی زندگی فانی نہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ کی زندگی ازلی و ابدی ہے اس کی کوئی ابتداء اور انتہاء نہیں ہے۔ اِس کی زندگی میں زمانہ نہیں ہے۔ مخلوقات کی زندگی زمانے کی حدود میں محدود ہے اور اس کی زندگی حیات مطلقہ ہے۔ اس جیسا کوئی نہیں ہے وہ مخلوقات کی زندگیوں میں موجود خصوصیات سے بالاتر ہے۔

امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں:

القیوم القائم الحافظ لکل شیءٍ والمعطی لهٗ ما به قوامه وذالک هو المعنیٰ المذکوره فی قوله تعالیٰ والذی اعطی کل شیءٍ خلقهٗ ثم هُدی. (۱)

’’قیوم تمام اشیاء کا قائم رکھنے والا اور ان کی حفاظت کرنے والا ہے۔ قیوم وہ ہے جس نے ہر موجود کو اُس کا ذریعہ قوام اور اُس کی بقاء کے لئے کام آنے والا سرمایۂ عطا فرمایا ہے۔ یہ وہی ہستی ہے جس کا تذکرہ قرآنِ حکیم کی اِس آیت میں کیا گیا ہے۔ وہ اللہ جس نے ہر شے کو وہ سب کچھ دیا جو اِس کی تخلیق کے لئے لازم ہے اور پھر اِس کو ہدایت کی۔‘‘

حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام فرعون کے پاس آئے اور اُسے دعوتِ توحید دی تو فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا:

قَالَ فَمَنْ رَّبُّکُمَا یٰمُوْسٰی ۝ قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ۝ (۲)

’’(فرعون نے) کہا تو اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟ ۝ (موسیٰ علیہ السلام

(۱) راغب، اصفهانی، المفردات: ۲۱۷

(۲) طه، ۲۰: ۴۹، ۵۰

نے) فرمایا: ہمارا رب وہی ہے جس نے ہر چیز کو (اس کے لائق) وجود بخشا پھر (اس کے حسبِ حال) اس کی رہنمائی کی ○''

اس آیت سے یہ امر متحقق ہوا کہ:

اُس نے کہا: اے موسیٰ! تم دونوں کا خدا کون ہے؟ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: ہمارا رب وہ پروردگار حکیم و دانا ہے جس نے اپنے حکیمانہ انداز کے مطابق قائم کئے ہوئے نظام میں ہر زندہ موجود کو وہ سب کچھ دے دیا ہے جو اُس کے لئے ضروری تھا اور اُسے وہ سب کچھ عطا کر دیا ہے جو اُس کے اپنی زندگی گزارنے کے لئے لازمی تھا۔ اِس کے علاوہ اُس کو اپنی زندگی کی راہ بتائی اُسے اُس کی زندگی کی ضروریات کی پہچان دی اور اپنے اعضاء وجوارح سے صحیح استفادہ کرنے کے لئے اُس کی رہنمائی کر دی ہے۔

ہر شے لوازم حیات سے آراستہ ہے

پانی میں رہنے والا ایک معمولی سا کیڑا ہو یا خشکی پر زندگی بسر کرنے والا ایک ضعیف سا مچھر اِنسان یا حیوان کے خون سے غذا پاتا ہے وہ بھی اپنی زندگی گزارنے کے لئے تمام لوازِم حیات سے آراستہ دکھائی دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کیڑے کے جسم میں اِس قدر لچک اور نرمی رکھی ہے کہ وہ بآسانی پانی میں تیر سکتا ہے اور اُس کے بدن کی ساخت اِس طرح کی ہوتی ہے کہ دائمی طور پر پانی میں رہنے کی وجہ سے کمزوری اور بوسیدگی کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ اپنی خوراک کو اچھی طرح پہنچانتا ہے اور لپک کر اُس کا شکار کرتا ہے اور اپنی بھوک مٹاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مچھر کو پر عطا کئے ہیں اور وہ پرواز کر کے اپنی غذا کے مقام کو ڈھونڈ لیتا ہے۔ اِس کے پاس ایک نازک سی نوک دار سونڈ ہوتی ہے۔ اُسے اِس بات کا علم ہے کہ اِس سونڈ کو اِنسان حیوان کی رگ میں اُتار کر اپنی غذا حاصل کرے۔

غرض اللہ قیوم نے تمام حشرات اور سارے حیوانات چرند، پرند کو کچھ اِس طرح پیدا فرمایا اور اُن کو ایسے اعضائے بدن اور ایسے قویٰ سے مسلح کر دیا ہے جو اُس ماحول کے

عین مطابق اور سازگار ہوتی ہے۔

نظامِ کائنات قدرتِ خداوندی کی حکیمانہ تدبیر کا زندہ ثبوت ہے

عرفاء و کاملین نے پرندوں کی خلقت بیان کر کے توحید کا حکیمانہ استدلال کیا ہے۔ لمبی ٹانگوں والے پرندے ہوں یا لمبی گردن والا حیوان زرافہ یہ تمام پرند اور حیوان اِس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ سارا نظام خداوند قدوس کی حکیمانہ تدابیر کا زندہ ثبوت ہے۔ حضرت سیدنا امام جعفر رضی اللہ عنہ صادق لمبی ٹانگوں والے پرندے سے متعلق بیان فرماتے ہیں:

’’چونکہ اِس کی زندگی کا اکثر وقت کم گہرائی والے پانی میں خوراک تلاش کرتے گذرتا ہے۔ اِس لئے یہ اپنی لمبی ٹانگوں کے ساتھ چوکیدار کی طرح پانی پر گہری نگاہ لگائے ہوئے ہوتا ہے جو کسی اونچی مچان پر جاسوسی کے لئے بیٹھا ہو۔ جونہی اِس کی اپنے شکار پر نگاہ پڑتی ہے تو پھر بڑی آہستگی کے ساتھ اِس کی طرف چل دیتا ہے اور بڑے آرام سے اُسے پکڑتا اور ہڑپ کر لیتا ہے۔ اب اگر اِس کی ٹانگیں چھوٹی ہوتیں تو جب یہ اپنے شکار کی طرف چلتا تو اِس کا پیٹ پانی سے ٹکراتا اور اِس میں تلاطم پیدا ہو جاتا۔ اِس سے کیڑے گھبرا کر بھاگ جاتے اور یہ پرندہ شکار نہ ملنے کے باعث بھوکا رہ جاتا۔ اِس لئے اللہ تعالیٰ نے اِس پرندے کو دو لمبی ٹانگیں عطا کر دیں تا کہ وہ اِن کے ذریعے اپنی غذائی ضروریات کو پورا کر سکے اور اپنے شکار کو پکڑنے میں کامیاب ہو جائے۔‘‘(۱)

ہر لمبی ٹانگوں والے پرندے کو لمبی گردن عطا فرمائی۔ ٹانگوں اور گردن کی لمبائی کی یہ ہم آہنگی رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ پرندہ اپنا لقمہ آسانی سے زمین سے اُٹھا سکے۔ اگر اِس کے برعکس ہوتا کہ ٹانگیں لمبی ہوتیں اور گردن چھوٹی ہوتی تو یہ زمین پر سے اپنی غذا اُٹھانے پر قادر نہ ہوتا۔ یہ الحیّ القیوم اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو اپنے حسبِ حال نواز رکھا ہے۔(۲)

(۱) ہارون یحییٰ، اللہ کی نشانیاں (مترجم ڈاکٹر تصدق حسین): ۳۷

(۲) عجیلی، الفتوحات الالھیہ، ۱: ۳۴

زرافہ کی گردن کی لمبائی سے متعلق حضرت سیدنا امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

''زرافہ کی گردن کی لمبائی درختوں سے غذا حاصل کرنے اور زندگی گزارنے کے ماحول کے عین مطابق ہے، کیونکہ اُس کی زندگی گھنے جنگلوں میں گذرتی ہے اور اِس کے بارے میں قیوم خالق و مالک کا فیصلہ یہی تھا کہ یہ درختوں کے پتوں سے اپنی غذا حاصل کرے۔ قیوم خالق نے اِبتداء ہی سے اِسے لمبی گردن والا پیدا فرمایا اور اُسے ایسے بدن اور ایسے عضو کے ساتھ آراستہ کر کے روانہ فرمایا جو اِس کی زندگی کی بقاء کے لئے لازمی تھا۔''(۱)

امام راغب اصفہانیؒ نے لفظ قیوم کا یہ معنی کہ ''المعطی لہٗ مابہ قوامہ'' یعنی وہ ہرشے کو وہ سب کچھ عطا کرنے والا ہے جس سے اُس کا قوام اور اُس کی بقاء ہے۔ یہ اِسی بنیادی و اساسی اُصول کی طرف اشارہ ہے۔ قیوم خالق نے ہر موجود کو وہ تمام وسائل حیات عنایت کر دیئے ہیں جو زندگی کی راہ میں اُس کی بقا اور قائم رہنے کے لئے ضروری ہو سکتے ہیں۔

الحیّ القیّوم کے بلا عطف استعمال ہونے کی حکمت

الحیّ القیوم دونوں صفاتِ خداوندی کا بلا عطف آیت الکرسی میں اِستعمال ہونا اِس میں نہایت بلیغ نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حیّ سے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ یہ کائنات حیّ یعنی زندہ خدا کے حکم سے زندہ ہوئی ہے۔ چونکہ صرف زندگی عطا کر دینا ہی زندگی کی بقا اور دوام کے لئے کافی نہیں جب تک اُسے وسائلِ حیات سے آراستہ نہ کیا جائے اور لوازم زندگی سے مسلح نہ کیا جائے۔ وہ اپنے ماحول کے مطابق زندگی گزارنے اور زندہ رہنے پر قادر نہیں ہوسکتا۔ اِسی لئے آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ''حیّ''

(۱) عجیلی، الفتوحات الالھیہ، ۱: ۳۴

ہونے کی صفت کے تذکرے کے فوراً بعد بلا عطف ''قیوم'' ہونے کی صفت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ یہی نکتہ سمجھایا گیا ہے کہ اللہ ''قیوم'' نے جہاں موجوداتِ کائنات کو نعمتِ زندگی سے مالا مال کیا، وہاں اِن کی زندگی گزارنے اور باقی رہنے کے لئے بڑے حکیمانہ انداز میں ضروری منصوبہ بندی بھی فرما دی ہے۔ چنانچہ تمام زندہ موجودات کو ایسے مناسب اعضا اور بہترین قویٰ عطا کر دیئے ہیں جو اِن کے ماحول سے بڑی مناسبت اور موافقت رکھتے ہیں اور وہ اِن سے کامل فائدہ حاصل کرنے پر قدرت و اختیار بھی رکھتے ہیں۔ پس اِن زندہ اشیائے کائنات کا ضروری اعضاء و جوارح و قویٰ سے آراستہ و پیراستہ ہونا بیک وقت اللہ تعالیٰ کی دو صفات ''حیّ اور قیوم'' سے متصف ہونے کا مظہر بن رہا ہے۔

اَلْقَیُّوْمُ کا دوسرا معنی: ازلی وجود کا مالک

قیوم کا دوسرا معنی ''الّذی لا بدء لهٗ'' وہ کہ جس کا کوئی آغاز اور اِبتداء نہ ہو۔ اِس معنی کے لحاظ سے قیوم اس ہستی کو کہیں گے کہ جو ازلی وجود کی مالک ہو۔ یعنی اُس کے وجود کے لئے نقطۂ آغاز اور اِبتداء کسی معین وقت یا زمانے کی ضرورت نہ ہو۔ گویا وہ ہمیشہ سے ہو۔ یہ ہستی اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ ذات واجب الوجود ازلی اور قیوم ہے اور اِس کے لئے کوئی آغاز نہیں ہے۔

وجودِ باری تعالیٰ کے بارے میں جدید ذہنوں کے شکوک وشبہات کا ازالہ

سوال کیا جاتا ہے کہ یہ جہاں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے لیکن خود اللہ تعالیٰ کا وجود کہاں سے آیا اور اِس کو کس نے پیدا کیا؟ اِس سوال کے جواب میں محقق علمائے فلاسفہ سے اِستفادہ کرنا ناگزیر ہے وہ کہتے ہیں ''الذاتی لا یعلل'' وہ شے جو کسی موجود کی ذات ہو یعنی وہ شی جو کسی موجود کی ذات کا مستقل لازمہ ہو۔ اِس لئے کہ ذات کبھی ذات سے

جدانہیں ہوتی۔ ذات کے وجود میں آتے ہی اِس کی ذات بغیر کسی علت وسبب کے وجود میں آجاتی ہے۔ مثلاً زوجیت یعنی جوڑا ہونا۔ دو کے عدد کی ذات کو لازم ہے اور یہ لازمہ اُس عدد کی ذات سے کبھی جدانہیں ہوسکتا۔ جہاں کہیں دو ہونا صادق آئے گا، وہاں اِس کا یہ لازمہ یعنی اُن کا جفت ہونا ایک ضروری شے ہے، لیکن اُس جفت ہونے کے تحقّق کے لئے دو ہونے کا تحقّق کافی ہے اور جب دو ہوئے تو جفت بھی ہوں گے لہٰذا ثابت ہوا زوجیت یعنی جفت ہونا دو ہونے کی ذاتی ہے اور اِس کا لازمہ ہے کیونکہ یہ ذاتی کبھی بھی اپنی ذات سے جدانہیں ہوسکتی۔ اب یہ نکتہ ذہن نشین کر لینا از بس ضروری ہے کہ وجود بھی واجب الوجود کی ذات کا لازمہ ہے۔ اس لئے نہ تو وجود ذات اللہ تعالیٰ سے جدا ہوسکتا ہے اور نہ ہی ذاتِ خدا وجود سے جدا ہوسکتی ہے۔ اس کے برعکس وہ ممکن الوجود ہے کہ جو از خود وجود نہیں رکھتا اور اِس کے لئے ضروری ہے کہ خدا اُس کو وجود بخشے تو وہ معرضِ وجود میں آئے لہٰذا ثابت ہوا کہ وجود تو پس ذاتِ واجب کا لازمہ ہے۔ اِس لئے یہ سوال کرنا ہی غلط ہے کہ وہ ہستی کہاں سے آئی؟ کیونکہ ذاتی علیحدہ علت وسبب کی طرف احتیاج ہی نہیں رکھتی۔ ایک اور پہلو سے اس سوال پر غور کیا جائے کہ کائنات کی روشنی تو نور سے ہے، لیکن خود نور کی روشنی کس چیز سے ہے؟ اِس طرح کائنات کا وجود تو اللہ تعالیٰ سے ہے لیکن خدا کا وجود کہاں سے ہوا؟ یاں یوں کہا جائے کہ تاریک اور اندھیرے جہاں میں روشنی تو نور کے صدقے آتی ہے، لیکن نور کس چیز سے روشن ہوتا ہے؟ اِس کا جواب یہ ہوگا کہ نور کسی دوسری چیز سے روشن نہیں ہوتا بلکہ نور کی روشنی نور کی ذاتی ہے اور یہ ذات نور کا لازمہ ہے۔ پس یہ جہان تو اللہ تعالیٰ سے وجود میں آیا اور اُس کے نور نے آسمان و زمین کو وجود بخشا ہے۔ لیکن خود اللہ تعالیٰ کا وجود کہیں اور سے نہیں آیا۔ کیونکہ وجود تو اُس ذاتِ واجب الوجود کا عین ذات ہے اور وہ ذاتِ حق عین وجود ہے۔ جب کہ کسی وجود کی ذاتی کسی دوسری علت کی محتاج نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ازلی اور قدیم ہے، وہ ہمیشہ سے ہے اور اِس کی کوئی اِبتداء نہیں ہے۔ قیوم کے اِس دوسرے معنی میں اِس سوال کا جواب ہے کہ خدا کہاں سے آیا ہے؟

اَلْقَيُّومُ کا تیسرا معنی

تاج العروس اور لسان العرب میں قیوم کا ایک تیسرا معنی یہ بیان ہوا ہے۔

القيوم هو القائم بنفسهٖ مطلقا لا بغيره وهو ماذالک بقوم بهٖ کل موجود. (۱)

’’قیوم وہ ذات واجب الوجود ہے کہ اپنے تمام صفاتِ کمال کے ساتھ خود بخود قائم ہے، وہ کسی غیر کی طرف معمولی سا احتیاج بھی نہیں رکھتی اور تمام موجودت کائنات اور پورا جہانِ ہستی اُس ذاتِ الٰہی کے سہارے قائم ہے۔‘‘

اِس معنی میں یہ اشارہ کیا جا رہا ہے کہ ہر ممکن لباس وجود کے ساتھ آراستہ ہونے کے بعد بھی ہر جگہ اور ہر حال میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی عظیم بارگاہ میں نیازمند، محتاج اور فقیر ہے۔ ہر شے موجود رہنے اور پھر باقی رہنے میں وہ مسلسل واجب الوجود ذات کی محتاج ہے۔ یہ جہانِ ہستی نہ صرف اپنے موجود ہونے میں اللہ ’’قیوم‘‘ کا محتاج تھا، بلکہ اِس جہان کا قیام اور اِس کائنات کا نظام بھی اِس کی ذاتِ اقدس سے وابستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کا فیض لحظہ بہ لحظہ اور دائمی طور پر پوری کائنات میں پہنچ رہا ہے اور وہ اُس کی قیوم کی صفت اور قدرت سے برقرار ہے۔ ممکنات کی اللہ تعالیٰ کی طرف یہ احتیاج ختم نہیں ہوتی بلکہ انہیں ہمیشہ ضرورت لاحق رہتی ہے۔ یہ فیض مسلسل اور متواتر برقرار ہے۔ کائنات کی تکوینی حرکات وسکنات کا تسلسل واستمرار کے ساتھ باقی رہنا اللہ ’’قیوم‘‘ کی صفت کا تقاضا ہے۔ پس یہ کائنات اللہ تعالیٰ کے زیرِ سایہ اور اِس کی متواتر دائمی عنایات کے ذریعے قائم ہوئی ہے۔ حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

كل شيءٍ خاضع لهٗ وكل شيءٍ قائم بهٖ. (۲)

(۱) ابن منظور، لسان العرب، ۴: ۱۷۷

(۲) نہج البلاغہ، شرح ابن الحدید: ۴۱۷

’’تمام کائنات اپنے خدائے مالک کی بارگاہ میں سرِتعظیم جھکائے ہوئے ہے اور اِس جہانِ ہستی کی ہر چیز اُس کے دائمی فیضان اور مسلسل نظرِ کرم کے صدقے قائم اور زندہ ہے۔‘‘

یا حیّ یا قیّوم کا ورد ہر درد کی دوا ہے

مقبولانِ بارگاہِ الٰہی ہر مقام پر اُس کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور ہر لمحہ اُس سے مدد طلب کرتے ہیں۔ یوں وہ اِس کے نام کے وسیلے سے اِس کی عنایاتِ کریمانہ کو اپنی طرف منعطف کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ عظیم مفسرِ قرآن علامہ اِسماعیل حنفی حقیؒ لکھتے ہیں:

قال علی رضی اللہ عنہ: لما کان یوم بدر جئت انظر ما یصنع النبيّ فإذا هو ساجد یقول: ’’یا حيّ یا قیوم‘‘ فترددت مرات وهو علی حاله لا یزید علی ذالک إلی أن فتح الله لهٗ. (۱)

’’حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں۔ غزوہ بدر کے دن میں یہ دیکھنے کے لئے آیا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سنگین اور وحشت انگیز کیفیت اور طاقتور دشمنوں کے مقابلے میں کیا تدبیر کر رہے ہیں تب میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سر سجدے میں رکھا ہوا ہے اور مسلسل ’’یا حیی یا قیوم‘‘ پکار رہے ہیں۔ میں کئی بار گیا اور واپس آیا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسی طرح سر سجدے میں رکھا ہوا تھا اور ’’یا حیی یا قیوم‘‘ کے علاوہ اور کچھ نہ کہتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اِس ذکرِ مبارک کو بار بار دہراتے رہے اور بالآخر اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غزوہ بدر میں فتح و نصرت عطا فرما دی۔‘‘

اس لئے اہل اللہ نے کہا ہے کہ یا حیّ یا قیّوم کا ورد ہر مشکل کی کنجی ہے اور

(۱) اسماعیل حقی، روح البیان، ۱: ۲۷۱

دینی و دنیاوی پریشانیوں کا اس میں علاج پوشیدہ ہے۔

یا حيُّ یا قیُّوم کا ورد سنتِ نبوی ﷺ سے ثابت ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضور نبی اکرم ﷺ کو کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو آپ ﷺ پڑھا کرتے:

یا حيُّ یا قیُّوم برحمتک أستغیث. (۱)

''اے زندہ اور قائم رکھنے والے میں تیری رحمت کے ساتھ مدد طلب کرتا ہوں۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ یہ پڑھا کرتے تھے:

یا حيُّ یا قیُّوم حین لا حي یا محي یا ممیت یا ذا الجلال والاکرام.

''اے زندہ اے سب کو سنبھالنے والے تو اس جب کوئی زندہ نہ رہے گا اس وقت تو ہی زندہ ہو گا اے زندہ کرنے والے اے مارنے والے اے جلال اور انعام والے۔''

اہل اللہ کا کہنا ہے کہ جو شخص کثرت سے **الحیّ القیوم** کا ورد رکھے گا وہ ان شاء اللہ کبھی بیمار نہ ہو گا نیز جو آدمی اس اسم ''**الحیّ القیوم**'' کو چینی کے برتن پر کستوری اور گلاب سے لکھ کر شیریں پانی سے دھو کر پیے گا یا کسی دوسرے بیمار کو پلائے گا اسے شفائے کاملہ نصیب ہو گی۔ اس کا کثرت سے ورد رکھنے والا لوگوں میں عزت و نیک نام پائے گا اور جو آدمی صبح کی نماز کے بعد سورج نکلنے تک یا حیّ یا قیوم کا ورد پکا کرے گا اس کی سستی و کاہلی اور غفلت و لاپرواہی دور ہو جائے گی۔

(۱) ترمذی، السنن، کتاب الدعوات، باب منه، ۵: ۵۳۹، رقم: ۳۵۲۴

صفتِ قیوم اور مسئلہ جبر و قدر

اللہ تعالیٰ کی صفت قیوم میں مسئلہ جبر و اختیار کی حقیقت ''امر بین الامرین'' بھی نکھر کر سامنے آ رہی ہے۔ اِنسان نہ تو اپنے اعمال و افعال میں مجبور و بے اختیار ہے اور نہ ہی مکمل طور پر مختار ہے، بلکہ اپنے تمام اُمور میں وہ بین بین یعنی بعض میں مجبور اور بعض میں مختار ہے۔ مطلق اختیار اپنے حقیقی معنی میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات سے مخصوص ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے کہ اِس کا ارادہ و اختیار اُس کی ذات سے قائم ہے اور وہ کسی شے یا کسی اِنسان کا محتاج نہیں ہے۔ وہ اللہ ہی ایسی ذات ہے کہ جو کچھ چاہے اُسے پوری آزادی اور اختیار کے ساتھ عمل میں لا سکتا ہے اور جس شے کے بارے میں جو ارادہ کرے عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔ اِس لئے کہ وہ بلا قید و شرط مختار اور صاحبِ ارادہ ہے۔ اِس جہان ہستی میں کوئی بھی اِس طرح کی آزادی اور اختیار کا مالک نہیں ہے اور ''قیوم'' کہتے ہی اُسے ہیں جو اپنے تمام صفاتِ کمال میں بذاتِ خود قائم ہو اور کسی غیر کی طرف معمولی سی احتیاج بھی نہ رکھے۔ اِس مرید و مختار رب کائنات نے اپنی حکیمانہ مشیت اور عالمانہ قضا کے ساتھ ارادہ فرمایا تو اِس جہانِ ہست و بود کو پیدا فرما دیا اور گونا گوں ذمہ داریاں اِن کے سپرد کر دیں۔ اِس جہانِ ہستی میں بیشتر موجودات ایسی ہیں جو اپنے سپرد کئے گئے کاموں میں مجبور ہیں اور از خود معمولی سا ارادہ و اختیار بھی نہیں رکھتیں۔ اللہ تعالیٰ کے جبر تکوینی نے اِن کے کام معین فرما دیئے اور ہر ایک کو اپنا کام انجام دینے پر لگا دیا۔ کرہِ ارض بالجبر چکر لگا رہا ہے، زمین کی کشش بالجبر اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ سمندروں اور دریاؤں کا پانی بالجبر سورج کی شعاعوں سے بخارات میں بدل جاتا ہے۔ تمام تکوینی قوانین و ضوابط بالجبر جاری ہو رہے ہیں اور کوئی موجود اِن تکوینی فرائض کی بجا آوری سے انحراف اور سرکشی کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اِس کائنات میں صرف ایک اِنسان ہے کہ جسے اختیار سے نوازا گیا ہے۔ لیکن اِنسان بذاتِ خود قائم نہیں بلکہ اِس کا وجود اور اِس کا اختیار و ارادہ ہر دو اللہ تعالیٰ کے ذریعے قائم ہیں اور یہ ہرگز مختار مطلق نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اِنسان کی مشیت اور آزادی کو اپنی مشیت سے وابستہ کیا ہے۔ نیکی و بدی کے انجام دینے میں جو وہ

اپنے اختیار و ارادہ کے ساتھ کام کر لیتا ہے یہ قدرت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت کو اپنے ارادہ ومشیت کے ساتھ اُس کی اطاعت میں اِستعمال کرتا ہے یا اُس کی مخالفت میں صرف کرتا ہے۔خلاصہ یہ کہ ''اللہ تعالیٰ کی صفت قیوم کے پیش نظر یہ سارا جہانِ ہستی اللہ تعالیٰ سے موجود اور قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِنسان آزاد پیدا فرمایا اور وہ اپنے اچھے یا برے افعال و اعمال میں مجبور نہیں ہے بلکہ اپنے ارادہ وا ختیار سے انجام دیتا ہے لیکن اِنسان اپنے اصل وجود اور اس کی ساری طاقتیں اُس ذات قیوم کے ساتھ قائم ہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انسان اپنے عمل میں آزادی مطلق کا مالک نہیں۔ایک ایسی آزادی رکھتا ہے جو جبر مطلق اور اختیار مطلق کے بین بین ہے۔آیت الکرسی اِنسانوں کو متوجہ کرتی ہے کہ وہی خدا بندگی کے لائق ہے جو قیوم ہے۔ یہ جہانِ ہستی اِس کے متواتر اور دائمی فیض کے ذریعے قائم ہے۔ایسے موجودات جو خود محتاج اور اُس قیوم کی عنایت و کرم کے نیاز مند ہیں وہ ہرگز معبود نہیں ہو سکتے۔ ہم یہاں ایمان بالقدر پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔

ایمانیات کے سلسلے کا ایک اہم ترین موضوع ''ایمان بالقدر'' ہے۔

''القدر'' قدر بقدر قدراً سے مصدر ہے جس کے لفظی معنی اندازہ لگانے، پیدا کرنے، لکھنے یا توانا ہونے کے ہیں، لیکن اصطلاحِ شریعت میں اس سے مراد خداوند تعالیٰ کا وہ ذاتی ارادہ ہے، جو مختلف حقائق کائنات کے تعلق میں اپنے اپنے مقررہ اوقات پر ظاہر ہوتا ہے۔(۱)

خداوند تعالیٰ کے ہاں ہر چیز کے بے پناہ خزانے ہیں، مگر ان خزانوں کو ایک خاص اندازے سے نازل کیا جاتا ہے۔ارشادِ باری ہے:

وَاِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ۔(۲)

(۱) دستور العلماء، ۳:۷۳، مطبوعہ حیدر آباد دکن

(۲) الحجر، ۱۵: ۲۱

’’ہر چیز کے ہمارے پاس بے شمار خزانے ہیں، مگر ہم اُنہیں ایک مقررہ اندازے سے ہی نازل کرتے ہیں۔‘‘

اِسی مسئلے کا نام مسئلہ تقدیر یا مسئلہ قضا و قدر ہے۔

جو ارکانِ ایمان میں سے آخری مگر انتہائی مہتم بالشان رکن ہے مگر انتہائی مہتم بالشان جزو ہے، لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اسی مسئلے کی نسبت لوگوں کے ذہنوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات اور اوہام و وساوس پائے جاتے ہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے اس موضوع پر کرید کرید کر گفتگو سے منع فرمایا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ شیطان تم میں کسی ایک کے پاس آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ تجھے کس نے پیدا کیا، فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا، یہاں تک کہ وہ پوچھتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ بس یہاں رُک جاؤ، شیطان کے شر سے خدا کی پناہ مانگو۔ اس سے آگے نہ سوچو۔(۱)

مقصد یہ تھا کہ لوگ اس پیچیدہ اور نازک مسئلے میں خواہ مخواہ اُلجھ کر اپنی عاقبت نہ خراب کر بیٹھیں۔ کیونکہ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ انسانی عقل و دانش اس نازک مسئلے کے حقیقی مضمرات کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ لہٰذا اس موضوع پر بحث و تمحیص میں حد سے آگے بڑھنے کا نتیجہ گمراہی ہی ہوسکتا ہے۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ’’انسان کے مجبور یا مختار‘‘ ہونے کا مسئلہ صرف مذہبی فلسفے کا ہی موضوع بحث نہیں رہا، بلکہ یہ دُنیا بھر کے فلاسفہ، مفکرین اور علماء کا محبوب ترین موضوع رہا ہے۔ نفسیات، جرمیات، عمرانیات اور دیگر مختلف فلسفوں میں اس مسئلے پر سیر حاصل مباحث ملتے ہیں۔ جنہیں مسلم اور غیر مسلم مفکرین اور فلسفیوں نے اپنے اپنے فکر اور

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب بدء الخلق، باب صفة إبليس وجنوده، ۳: ۱۱۹۴، رقم: ۳۱۰۲

۲۔ مسلم، الصحیح، کتاب الإیمان، باب بیان الوسوسة في الإیمان، ۱: ۱۲۰، رقم: ۱۳۴

اپنے اپنے علم سے فروغ بخشا ہے۔ پھر یہ زبان، ادب اور شاعری کا بھی موضوع رہا ہے۔ اس بنا پر اس مسئلے میں قسم قسم کی آراء ملتی ہیں۔ اسی لئے اس کے اثرات خواص سے لے کر عوام تک کے ذہنوں کو متاثر کرنے میں اہم کردار انجام دیتے ہیں۔

(الف) خلقِ عمل اور کسبِ عمل میں فرق

اس سلسلے میں قرآن کریم تقدیر کے جس کلیے پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان اور اس کے جملہ اعمال کو اللہ تعالیٰ نے تخلیق کیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے:

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ○(۱)

’’حالانکہ تم کو اور تمہارے اعمال کو خدا نے ہی پیدا کیا ہے○‘‘

اس آیت میں انسان اور اس کے اعمال دونوں کی تخلیق کو خداوند تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، مگر یاد رہے کہ تخلیق اور کسب دو مختلف المعانی اور مختلف المقاصد الفاظ ہیں، کسب (اسی سے اکتساب بر وزن افتعال ہے) کے معنی کرنے یا کمانے کے ہیں۔ جبکہ خلق اور تخلیق کے معنی کوئی چیز پیدا کرنے اور وجود میں لانے کے ہیں۔ انسان اپنے افعال کا مکتسب (یعنی کمانے اور کرنے والا) ہے، مگر ان کا خالق اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ انسان اور اُس کی تمام تر اشیاء و اعمال مخلوقِ محض ہیں، جبکہ خداوند تعالیٰ دُنیا کی ہر چیز کے خالق و باری ہیں۔ اس طرح اس کائنات میں فقط دو تصورات رہ جاتے ہیں، اوّل خداوند تعالیٰ کے خالق ہونے کا تصوّر اور دوم انسان اور اُس کے جملہ افعال کے مخلوق ہونے کا تصور۔ خالق ہر فعل میں خالق ہے اور مخلوق اپنی ہر صفت میں مخلوق۔

خدا اور اُس کی ذات و صفات کے سوا چونکہ کائنات کی ہر ادنیٰ و اعلیٰ چیز مخلوق ہے، اس لئے کائنات اور اس میں وقوع پذیر ہونے والے اعمال و افعال بھی مخلوق ہیں۔

(۱) الصافات، ۳۷: ۹۶

جن کی من حیث المخلوق، تخلیق تو باری تعالیٰ نے کی ہے، مگر کسب و ارتکاب انسان اپنی رضا و رغبت سے کرتا ہے۔ اس لئے اب اس سوال کا جواب کہ انسان کی اپنے افعال کی طرف کیا نسبت ہو گی۔ قرآن کریم یہ واضح کرتا ہے کہ انسان اپنے افعال کا خالق نہیں، بلکہ کاسب، مکتسب اور مرتکب ہے۔ ارشاد فرمایا گیا:

بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ○(۱)

''ہاں جو برے کام کرے اور اس کے گناہ ہر طرف سے اسے گھیر لیں تو ایسے لوگ دوزخ میں جانے والے ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے○''

لَهَا مَا کَسَبَتْ وَ عَلَیْهَا مَا اکْتَسَبَتْ۔(۲)

''اگر اس نے نیک کام کئے تو اسی کو فائدہ پہنچے گا اور اگر برے کام کئے تو اسی کو اس کا نقصان اُٹھانا پڑے گا۔''

جس طرح کائنات کی ہر چیز خدا کی مخلوق ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ بڑی ہے یا چھوٹی، انسان ہے یا حیوان، جن ہے یا فرشتہ، سیارہ ہے یا ستارہ، زمین ہے یا کوئی اور خطہ، سمندر ہے یا خشکی، جمادات میں سے ہے یا حیوانات سے، مادہ ہے یا توانائی، کوئی خارجی وجود ہے یا ذہنی تصوّر، کوئی عملی حقیقت ہے یا فکری تخلیق، ہر چیز اپنے وجود میں خدا تعالیٰ کی صفتِ خلّاقیت وصنّاعی کی آئینہ دار اور اپنے ہونے اور باقی رہنے میں اسی کی محتاج ہے اور اس کا خالق صرف اللہ ہے، اسی طرح انسان جو بھی عمل کرتا ہے۔ مثلاً اس کا گفتگو کرنا، اس کا آرام کرنا، اس کا کھیلنا کودنا، اس کا حوائجِ ضروریہ کی تکمیل کرنا، اس کا اُٹھنا بیٹھنا، اس کا چلنا پھرنا، آنا جانا اس کا ہر کام اپنے وجود میں ایک فعل اور عمل ہے اور ہر فعل

(۱) البقرہ، ۲: ۸۱

(۲) البقرۃ، ۲: ۲۸۶

ایک وجود ہونے کے اعتبار سے خدائی مخلوق ہے۔ کیونکہ فعل بھی انسان ہی کی طرح انفس و آفاق پر مشتمل اسی کائنات کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ لیکن اکتساب کی ذمہ داری کے اعتبار سے اس فعل کو انسان کا فعل کہیں گے خدا کا نہیں۔ چنانچہ اس کی نسبت بہر حال انسان کی طرف ہی ہو گی، جیسے کہ مذکورہ بالا آیت میں الفاظ ''وَمَا تَعْمَلُوْنَ'' (اور جو تم عمل کرتے ہو) میں فعل کے انجام دینے کی ذمہ داری انسان پر عائد کی گئی ہے۔ گویا عمل ایک ہے، مگر اس کے پہلو دو ہیں۔ ایک پہلو کے اعتبار سے وہ خدا تعالیٰ کی مخلوق ہے، اور دوسرے کے اعتبار سے انسان کا مکسوب۔ اس تصور کو سمجھنے کے لئے بچے کے تخلیق کے عمل ہی کو لیجئے: ہر شخص جانتا ہے کہ بچہ محض مرد و عورت کے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جانے ہی سے پیدا نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی پیدائش کے لئے ''امرِ ایزدی'' کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ کتنے ہی جوڑے ایسے ہیں کہ برسہا برس گزر جانے کے باوجود ان کے دامن بچوں کی نعمت سے محروم رہتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بچے کی تخلیق میں بنیادی عمل دخل ''رشتۂ ازدواج'' کا ہی ہوتا ہے۔ گویا کسباً تو بچے کو وجود والدین کے دم قدم سے ملا لیکن خلقاً یہ خدا تعالیٰ کی عطا کا مرہون منت ہے۔

اسی لئے قرآن کریم میں ایسے ''جوڑوں'' کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے جو اولاد کی نعمت کو اپنی طرف یا کسی اور سفلی ذریعے کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ارشاد ہے:

فَلَمَّا اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَا اٰتٰهُمَا فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ○ (۱)

''پس جب خدا تعالیٰ نے ان کو صحیح و سالم بچہ عطا کر دیا تو وہ اس کے خلق میں شریک ٹھہرانے لگے، حالانکہ اللہ تعالیٰ شریک کئے جانے سے بلند و بالا ہے۔''

حالانکہ اولاد کی نعمت عطا کرنا، یا اس سے محروم رکھنا اور اسی طرح دیگر انسانی حاجات کی تکمیل کرنا خالصتاً اللہ رب العزت کا فعل ہے۔ اسی طرح ہر انسانی عمل اپنے

(۱) الاعراف، ۷: ۱۹۰

کسب میں انسانی ہاتھوں کا محتاج ہے۔ مگر اپنے وجود اور اپنی ہستی میں خدا تعالیٰ کے حکم ''کن'' کا دستِ نگر ہے۔

کیا مخلوق ہونے کے لئے دیکھا جانا ضروری ہے؟

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ انسانی عمل دیکھنے میں تو انسان ہی کی تخلیق محسوس ہوتا ہے، اسے انسانی کسب سے الگ ایک مخلوق کس طرح مان لیا جائے۔ اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہر مخلوق کے لئے الگ طور پر قابلِ دید ہونا بھی ضروری ہے یا نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ہر مخلوق، بحیثیت ایک مخلوق کے، ہر ایک کے لئے مرئی نہیں ہوا کرتی۔ قرآن کریم میں قسم کھا کر یہ کہا گیا ہے:

فَلَا اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ○ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ○[1]

''قسم ہے ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو○ اور جن کو تم نہیں دیکھ سکتے○''

سائنس بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ دُنیا میں بہت سی اشیاء موجود ہونے کے باوجود نظر نہیں آ سکتیں۔ مثلاً اس کمرے میں ٹنوں کے حساب سے ہوا موجود ہے۔ مگر یہ ہوا انسانی آنکھ یا خوردبین کے ذریعے نہیں دیکھی جا سکتی۔ اسی طرح انسانی آواز مخلوق ہے اگر تھوڑی دیر کے لئے کان بند کر لئے جائیں تو آنکھوں اور دوسرے حواس کی مدد سے اس کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ کسی چیز کا مرئی ہونا (یعنی دکھائی دینا) اس وقت ضروری ہے، جبکہ اس کا طبعی وجود کثیف ہو اور دوم یہ کہ اس کی محسوس اور معلوم کرنے والی خاص حس اپنی صحیح حالت میں ہو۔ جو اشیاء غیر حسی ہوں یا ان کو محسوس کرنے والے حواس میں نقص ہو تو ایسی صورت میں کوئی چیز خارج میں پائے جانے کے باوجود محسوس نہیں کی جا سکتی۔

خود انسان حسی اور کثیف وجود رکھتا ہے اس لئے اس کا موجود ہونا آنکھوں سے

(۱) الحاقه، ۶۹: ۳۸

دیکھا جا سکتا ہے، مگر اس کا عمل بذاتِ خود ایک لطیف وجود ہے، لہٰذا اس کے اثرات و نتائج کا تو ہم مشاہدہ کرتے ہیں اور اس کے ارتکاب میں استعمال ہونے والے اعضاء کو تو ہم دیکھ سکتے ہیں مگر ان اعضاء و جوارح اور اثرات و نتائج سے قطع نظر فی نفسہٖ عمل کے وجود کو محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی مثال بالکل ایسے ہے کہ رحم اور محبت حقیقت میں اپنا اپنا وجود تو رکھتے ہیں، لیکن جب تک انہیں آپ ماں کی مامتا، باپ کی شفقت اور دوست کے اخلاص کے روپ میں نہ دیکھیں، ان کا وجود از خود دکھائی نہیں دے سکتا، یعنی اُنہیں دیکھنے کے لئے کسی رحم دل شخص کے عمل اور کسی محبت کرنے والے کے التفات کا سامنے ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ انسانی یا حیوانی ظرف نہ ہوں تو رحم، غصہ، محبت، نفرت، بخل، حرص اور تکبر وغیرہ جیسے اوصاف دکھائی نہیں دے سکتے۔ گویا اوصاف کے وجود کا انکار ممکن نہیں۔ لیکن ان کے ظہور کے لئے کسی مظہر کا ہونا ضروری ہے۔ ان کے پائے جانے کا انکار ممکن نہیں مگر انہیں سمجھنے کے لئے کوئی ذریعہ چاہیے۔ جو شے خود ایک لطیف یا غیر حسی وجود رکھتی ہو اسے معلوم کرنے کے لئے اس کا اتصال کسی حسی اور کثیف حقیقت سے ہونا ضروری ہے۔ جیسے جان جسم کے بغیر دکھائی نہیں دیتی، اسی طرح عمل، کسی عامل کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بغیر نہیں۔ لہٰذا عامل کو، عمل کا خالق نہیں بلکہ اس کا کاسب تصوّر کیا جائے گا۔ کیونکہ اس نے عمل کو فی نفسہٖ پیدا نہیں کیا بلکہ اسے کر کے دکھایا ہے۔

جزا و سزا کا تعلق کسب سے ہے نہ کہ خلق سے

قرآن کریم یہ حقیقت بھی پوری طرح واضح کر دیتا ہے کہ اگرچہ ہر انسانی عمل تخلیق کے اعتبار سے تو مخلوقِ خدا ہے، لیکن صدور اور ظہور کے اعتبار سے انسان کا کسب ہے اور کسب و ارتکاب چونکہ آزادانہ ہے اس لئے وہی اپنے عمل کے انجام کا ذمہ دار ہے کیونکہ جزا و سزا کا تعلق کسبِ اعمال سے ہوتا ہے نہ کہ خلقِ اعمال سے۔ اسی بنا پر سورۃ الملک میں انسانی تخلیق کا مقصد واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ (۱)

(۱) الملك، ۶۷: ۲

''اس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے۔''

موت و حیات بھی اپنی تخلیق کے اعتبار سے، خدا تعالیٰ کی مخلوق ہیں مگر اپنے واقع ہونے کی مناسبت سے ان کا وجود کسی نہ کسی سبب کا رہینِ منت ہے۔ زندگی، اعمال کے ارتکاب کا سبب بنتی ہے اور موت عالمِ آخرت میں ان کے نتائج کے مشاہدے کا۔ دُنیا میں موت و حیات کی تخلیق کی غرض و غایت بھی یہی ہے کہ یہ دیکھا جا سکے کہ کون اچھے اعمال اپناتا ہے اور کون برے۔ اسی تصور کو قرآن کریم دوسری جگہ واضح کرتا ہے:

وَمَا اَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ. (۱)

''اور جو مصیبت تم پر نازل ہوتی ہے سو وہ تمہارے اعمال ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔''

ایک دوسری جگہ اسی حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللهِ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ. (۲)

''تمہیں جو اچھائی پہنچتی ہے وہ خدا کی طرف سے پہنچتی ہے اور جو برائی پہنچتی ہے وہ تمہاری اپنی طرف سے ہے۔''

گویا نعمت کے حصول میں تو خدا تعالیٰ کا لطف و کرم شامل ہوتا ہے، مگر مصیبت کے وقوع میں خالصتاً انسان کی اپنی غلطیوں کا عمل دخل ہوتا ہے، اگرچہ ہر اچھائی اور برائی کی خلقت ہوتی من جانب اللہ ہے۔ لیکن ادب بندگی یہی ہے جس کی اوپر تعلیم دی جا رہی ہے۔ یعنی انسان دنیا میں جن نقصانات، مشکلات اور آزمائشوں سے دوچار ہوتا ہے وہ سب اس کے اپنے اعمال کے نتائج و ثمرات ہیں۔

(۱) الشوریٰ، ۴۲: ۳۰

(۲) النساء، ۴: ۷۹

یہ تو انفرادی شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والی مصیبتوں کا ذکر تھا، دوسری جگہ اجتماعی زندگی کی مشکلات کو بھی لوگوں کے اپنے اعمال کے نتائج قرار دیا گیا۔ ارشاد فرمایا گیا:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِی النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِیْ عَمِلُوْا. (۱)

''خشکی اور تری میں لوگوں کے اپنے اعمال کے سبب سے فساد پھیل گیا ہے تاکہ وہ لوگوں کو ان کے بعض اعمال کا بدلہ چکھائے۔''

اس دنیا میں نیکی یا بدی کا خلقی وجود گو من جانب اللہ ہے مگر اس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ان کے کسب کی ذمہ داری ان کے خالق پر عائد نہیں ہوتی اس لئے کہ اللہ کا فعل مطلقاً خلق ہے نہ کہ کسب وارتکاب۔ خلق کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو اچھائی اور برائی میں تمیز کا شعور اور اختیار بخشا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ انسان عمل کے کس پہلو کو اختیار کرتا ہے۔ پھر ہر عمل کی تخلیق کے ساتھ ساتھ ہدایتِ ربّانی کے ذریعے اس عمل کے نتائج وعواقب سے بھی انسان کو باخبر کردیا جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے فتنہ وشر اور بدی کا راستہ اختیار کرے تو وہ اپنے اعمال کی جزا وسزا کا ذمہ دار کیوں نہ ٹھہرایا جائے؟

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس تفصیل سے یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ انسان سے اگر مؤاخذہ ہوتا ہے تو اس لئے کہ وہ بقائمی ہوش وحواس، اپنی مرضی اور اپنے ارادہ واختیار سے کسی عمل کا ارتکاب کرتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بے سود ہے کہ جب ہر عمل کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو انسان کو کیوں لائقِ تعزیر گردانا جاتا ہے؟ انسان کو بلاوجہ نہیں پکڑا جاتا، اس کی گرفت اس کے سبب

(۱) الروم، ۳۰: ۴۱

واختیار کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہی غلط فہمی مشرکین مکہ میں بھی موجود تھی چنانچہ وہ کہا کرتے تھے:

لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَا اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ.(۱)

''اگر خدا تعالیٰ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتے اور کسی چیز کو اپنی مرضی سے حرام نہ ٹھہرا سکتے۔''

مگر اس کے جواب میں ان سے کہا گیا کہ محض برائی کا وجود اس کے جائز ہونے کا ثبوت نہیں ہوسکتا، برائی اور اچھائی تو ازل سے موجود ہے اور اسی غرض کے لئے ہے کہ اکتساب کے حوالے سے لوگوں سے اچھے اور برے کا امتیاز پیدا ہوسکے۔

خدائی فعل ''خلق'' کی حقیقت تو فقط اتنی ہے کہ اس نے اپنی دوسری بہت سی مخلوقات کی طرح انسانی اعمال کو بھی تخلیق کیا اور انسان کو بھی پیدا کر کے اسے اختیار دے دیا کہ وہ جس قسم کے اعمال چاہے اپنے لئے منتخب کر لے۔ اس لئے انسان اپنے اختیار سے اعمال کا جو چناؤ کرے گا اور جس قسم کے اعمال کو اپنے کسب وارتکاب کے لیے مختص کرے گا وہ اسی طرح کی جزا یا سزا کا مستوجب ہوگا۔ اگر غور کیا جائے تو صاف نظر آ جاتا ہے کہ اس پوری کائنات میں ذمہ داریوں کا نظام بھی کسب پر ہی چل رہا ہے نہ کہ خلق پر۔

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی ضد پیدا کی ہے، دن کے ساتھ رات، آرام کے ساتھ بے آرامی، راحت کے ساتھ تکلیف، خیر کے ساتھ شر، حق کے ساتھ باطل، صدق کے ساتھ کذب، رحم کے ساتھ ظلم، نیکی کے ساتھ بدی اور جنت کے ساتھ دوزخ۔ اب محض ایک چیز کا موجود ہونا اس کے اپنانے کی ذمہ داری سے برأت کی دلیل نہیں ہوسکتا۔ اگر خدا تعالیٰ نے سائے کے ساتھ دھوپ کو پیدا کیا تو اس لئے نہیں کہ کوئی سخت گرمی میں دھوپ میں جا بیٹھے اور کسی تکلیف کے واقع ہوجانے کے بعد، وہ یہ کہے کہ میری تکلیف کا باعث خدا تعالیٰ کا دھوپ کو پیدا کرنا ہے؟ اس صورت میں اس کے اس قول پر کون شخص

(۱) الانعام، ۶: ۱۴۸

یقین کرے گا؟ اُلٹا ہر کوئی اسی کو کہے گا کہ خدا تعالیٰ نے دھوپ اور سائے کی تخلیق تو اس لئے فرمائی تھی کہ انسان کو گرمیوں میں سائے اور سردیوں میں دھوپ دونوں کی راحت میسر آسکے۔ دھوپ کی تخلیق کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ کوئی شخص بلا مقصد برہنہ سر یا برہنہ پا چلچلاتی دھوپ میں چلے پھرے اور خواہ مخواہ کسی تکلیف سے دوچار ہو جائے اگر خود انسان نے اس کا استعمال غلط طریقے پر کیا تو اس سے تخلیق کا کیا قصور ثابت ہوا۔

(ب) انسان کے مختار یا مجبور ہونے کا مسئلہ

مسئلہ تقدیر کے ضمن میں ایک مسئلہ انسان کے مجبور یا مختار ہونے کا بھی ہے کہ آیا انسان کو مکمل طور پر مختار سمجھا جائے یا مجبورِ محض۔

تاریخِ اسلام میں ایسے متعدد فرقوں کا ذکر ملتا ہے جن میں سے بعض کا یہ خیال تھا کہ انسان مکمل طور پر مجبور ہے اور وہ ایک تنکے کو بھی اپنی مرضی سے ہلانے کا اختیار نہیں رکھتا، جبکہ ان کے بالمقابل بعض ایسے لوگ بھی تھے جو انسان کو مکمل طور پر آزاد اور خودمختار قرار دیتے تھے۔ حالانکہ قرآن و سنت کی روشنی میں جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ ''بین القدر والجبر'' ہے۔

اس ضمن میں حقیقت بالکل واضح ہے کہ انسان نہ تو کلیتاً ایسا مختار ہے کہ اس پر کوئی قدغن ہی نہ ہو اور نہ ایسا مجبور کہ وہ خود کو ہر ذمہ داری سے بری قرار دے سکے۔ انسان کی حقیقی حیثیت ''بین القدر والجبر'' ہے جو ایک معتدل کیفیت سے عبارت ہے۔ فی الواقع اسے اختیار و ارادے کی مکمل آزادی ہے لیکن اس کی آزادی میں نہ افراط ہے نہ تفریط۔

منقول ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے اس مسئلے کی بابت استفسار کیا تو آپ نے سائل سے فرمایا کہ اپنی ایک ٹانگ اُوپر اٹھاؤ، اس نے اٹھالی، پھر فرمایا کہ اب دوسری بھی اٹھاؤ، اس نے عرض کیا: یہ تو ناممکن ہے فرمایا کہ پہلی حد انسان کے اختیار کی تھی اور

دوسری حد اس کی مجبوری کی ہے۔ یعنی اس کا اپنا توازن اسے اختیار کی ایک خاص حد سے آگے گزرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

بین القدر والجبر کا مفہوم

بین القدر والجبر کے تصوّر کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ان مراحل کو سمجھا جائے جن سے گزر کر کوئی عمل تکمیل پذیر ہوتا ہے۔

ا۔ فرض اور خواہش میں کش مکش کا مرحلہ

سب سے پہلے انسان کے دل میں کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے سے متعلق ایک کش مکش پیدا ہوتی ہے یعنی اس کا فرض اور اس کی آرزو بیک وقت اس کے سامنے آتے ہیں اور پھر وہ اس احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ یہ کام کرے یا نہ کرے۔

یہاں یہ امر پیشِ نظر رہے کہ یہ احساس صرف شعوری اور اختیاری اعمال سے متعلق ہوتا ہے۔ جو اعمال غیر شعوری اور غیر اختیاری طور پر صادر ہوتے ہیں اور جنہیں اضطراری اعمال کہا جاتا ہے، ان کا ان مراحل سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ایسے افعال پر گرفت ہوتی ہے۔ عملاً اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص آپ کی آنکھ میں سوئی چبھونا چاہے اور اس کے خوف سے آپ کی پلکیں اضطراری طور پر بند ہو جائیں تو یہ ایک اضطراری فعل ہے اور ایسا فعل قابلِ مواخذہ نہیں، لیکن اگر یہی پلکیں بدنیتی سے کسی فعل ناحق کے لئے حرکت کریں تو یہ اختیاری اور ارادی فعل ہوگا اور اس پر گرفت ہوگی۔ حرکت ایک ہی ہے مگر ارادے اور نیت نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا۔

بہرحال اولاً ذہن میں ایک کشمکش سی پیدا ہوتی ہے مثلاً کسی کا مال دیکھ کر اسے ناجائز طور پر ہتھیانے کی خواہش پیدا ہوئی اور دوسری طرف خدا کے حکم نہی کا بھی خیال آ گیا۔ نتیجتاً دونوں خیالات اُبھرے اور ذہن میں ایک کشمکش سی شروع ہوگئی۔ اسی لئے اس ابتدائی سوچ کے مرحلے کو ''کشمکش کا مرحلہ'' کہا گیا ہے۔

۲۔ غور و خوض کا مرحلہ

اس کے بعد غور و خوض کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے، ذہن دونوں چیزوں کے ممکنہ نتائج یعنی فوائد و نقصانات کا جائزہ لیتا ہے، وہ خدائی حکم پر بھی نظر ڈالتا ہے اور دنیوی منافع پر بھی، اس طرح فعل کا ذہنی وجود کشمکش کے ابتدائی مرحلے سے گزر کر غور و خوض کے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ کشمکش اور غور و خوض کے دونوں مرحلوں پر انسانی ذہن کسی قسم کی مجبوری اور پابندی (Coersion & Compulsion) کا شکار نہیں ہوتا۔ یہ دونوں عمل ذہن اور شعور کی سطح پر آزادانہ طریقے سے واقع ہوتے ہیں۔

۳۔ انتخابِ نیت کا مرحلہ

اس کے بعد اگلا مرحلہ ذہنی فیصلے کا ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر انسان دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرتا ہے اور پوری سوچ بچار کے بعد اسے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ اچھائی کا مرتکب ہو یا برائی کا، صحیح راستے پر گامزن ہو یا غلط پر اور فرض کی پیروی کرے یا خواہشِ نفس کی، اسی ذہنی فیصلے کو ''انتخاب نیت'' کہتے ہیں۔ یہاں تک انسان اپنے ذہنی عمل سے گزرتا ہے، آپ ٹھنڈے دل سے سوچ کر بتایئے کہ کیا ان تینوں مرحلوں میں کسی اعلیٰ قوت نے انسان کو مجبور کیا؟ اسے خواہش کو اختیار کرنے یا فرض پورا کرنے کے درمیان غور و خوض پر کسی طرف سے خارجی دباؤ پڑا؟ ہرگز نہیں، یہ تو خالصتاً ذہنی قلبی اور داخلی عمل تھا۔ آپ نے مسئلے کے ہر پہلو کو اچھی طرح سے دیکھا اور پرکھا، ایک کشمکش اور ذہنی تصادم کے مرحلے سے گزر کر سوچ و بچار کے نتیجے میں ذہنی فیصلے کے مرحلے تک پہنچے۔ یہاں تک عمل مکمل طور پر آزاد ہے۔

www.MinhajBooks.com

۴۔ عزّم و ارادے کا مرحلہ

اس کے بعد عزم و ارادے کا مرحلہ آتا ہے۔ جہاں پہنچ کر آپ اپنے ذہنی فیصلے

یعنی نیت کو واقعہ بنانے اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے ذہنی طور پر کمربستہ ہو جاتے ہیں یہاں نیت اور ارادے میں فرق پیشِ نظر رہے کہ نیت، ذہنی سطح پر کسی چیز کو منتخب کرنے اور ارادہ اس نیت کی تکمیل پر ذہن کے کمربستہ ہوجانے کا نام ہے۔ گویا ارادہ، نیت کے انتخاب سے جنم لیتا ہے، نیت مقدم ہوتی ہے اور ارادہ مؤخر، لہٰذا ارادہ ہمیشہ نیت کے تابع ہوتا ہے۔

۵۔ تعمیل کا مرحلہ

اس کے بعد پانچواں مرحلہ ارادے کی تعمیل کا آتا ہے۔ جہاں پہنچ کر انسان عملی قدم اٹھاتا ہے۔ عملی تدبیر کیلئے سرگرم ہوجاتا ہے۔ اگر آپ نے بالفرض کسی دشمن کو مارنے کا ارادہ کر لیا ہے تو آپ کے عمل کا پانچواں مرحلہ کسی ہتھیار کے ساتھ اس پر حملہ کرنا ہوگا۔ لہٰذا تعمیل ہمیشہ ارادے کے تابع ہوتی ہے۔

۶۔ نتیجۂ عمل کا مرحلہ

جب ارادے کی تکمیل ہوچکی تو اب اس عمل کے نتیجے کے برآمد ہونے کا مرحلہ آتا ہے۔ مثلاً ہتھیار استعمال کرنے سے وہ شخص مر جائے یا زخمی ہوجائے گا۔ یہ نتیجہ آپ کے مرحلۂ تعمیل کے تابع ہے جبکہ مرحلۂ تعمیل خود عزم و ارادے کے تابع ہے اور انتخابِ نیت کا مرحلہ خود کسی شے کے تابع نہیں، کیونکہ وہ محض غور و خوض کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔

یہ ہیں چھ مراحل جن سے کوئی عمل گزر کر اپنے نتیجے کے مرحلے تک پہنچتا ہے۔ بتایئے ان مراحل میں سے وہ کون سا مرحلہ ہے جہاں آپ پر کوئی خارجی دباؤ موجود تھا؟ ذہنی کشمکش سے لے کر نتیجۂ عمل تک آپ خود بخود آگے بڑھتے چلے گئے اسی اقدام کا نام ''کسبِ عمل'' ہے۔

بالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عمل کے چھ مرحلے دو حصّوں میں منقسم ہیں۔

پہلا حصہ ذہنی کشمکش سے شروع ہو کر انتخابِ نیت کا تھا، جبکہ دوسرا ارادے سے شروع ہو کر نتیجۂ عمل تک محیط تھا۔ ان میں سے پہلے حصے میں آدمی خود مختار اور آزاد ہوتا ہے لیکن دوسرے حصے میں خود اپنے انتخابِ نیت کا پابند۔ لیکن یہ مجبوری کیسی؟ خود اپنی سوچ اور نیت کی مجبوری۔ اسی لئے حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إنّما الأعمال بالنّيات. (۱)

''اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔''

مزید فرمایا:

إنّ الله لا ينظر إلى صوركم وأموالكم ولكن ينظر إلى قلوبكم و أعمالكم. (۲)

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہاری شکلوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے اعمال اور دلوں کو دیکھتا ہے۔''

گویا اللہ تعالیٰ کے ہاں عمل کی ذمہ داری کا فیصلہ انسان کی نیت اور اس کے تحت ارادے کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسی نیت ہوگی ویسی ہی جزائے عمل ہوگی اسی بنا پر قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

وَ مَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللهِ. (۳)

''اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی رضا کی نیت سے اپنے گھر بار سے ہجرت

(۱) بخاری، الصحیح، باب بدء الوحی، ۱: ۳، رقم: ۱

(۲) مسلم، الصحیح، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم الظلم وخذله، ۴: ۱۹۸۷، رقم: ۲۵۶۴

(۳) النساء، ۴: ۱۰۰

کے لئے نکلے، پھر راستے میں اسے موت آ لے تو اللہ تعالیٰ پر اس کا اجر ثابت ہو گیا (یعنی اسے پورے عمل کی جزا عطا کی جائے گی)۔‘‘

کیونکہ خدا کی ذات یہ نہیں دیکھتی کہ اس کا یہ عمل اپنے انجام تک پہنچا یا نہیں؟ بلکہ یہ دیکھتی ہے کہ اکتساب عمل میں اس کی نیت کیا تھی۔

قرآن و حدیث میں اسی بنا پر نیت کے اخلاص اور اس کی درستگی پر زور دیا گیا ہے اور اسی پر ہی تمام فوائد و ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔ نیت سے ہی ایک شخص مخلص مسلمان اور نیت سے ہی ایک شخص منافق سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ زبان اور ظاہر کی حد تک قول دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ انسان اچھائی یا برائی کے ارتکاب کے لئے جب اپنی نیت کا انتخاب کرتا ہے اس وقت وہ مکمل طور پر باشعور اور بااختیار ہوتا ہے۔ اسے دونوں راستوں میں سے کسی بھی راہ کو اپنانے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ مرحلہ خالصتاً اس کے اپنے ذہنی فیصلے کا ہوتا ہے۔ اسی آزادی کی بنا پر وہ ’’شخص‘‘ ’’بااختیار‘‘ تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے اسی اختیار کے باعث اس سے جواب طلبی اور مواخذہ بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ بقیہ تمام مراحلِ عمل اس کی آزادانہ منتخب شدہ نیت کے تابع ہوتے ہیں۔ رہا خارجی مجبوریوں اور حالات کی پریشانیوں کا دباؤ تو اس کا اثر نیت کے مرحلے پر نہیں بلکہ عزم و ارادے کے مرحلے (چوتھے مرحلے) پر ہوتا ہے۔ کیونکہ عزم و ارادہ اُصولی طور پر تو انتخابِ نیت کے تابع ہوتا ہے لیکن کسی مجبوری کے باعث یہ ارادۂ نیت (ذہنی طلب اور قلبی فیصلے) کے خلاف بھی ہوسکتا ہے۔ یعنی دل تو کچھ اور چاہتا ہو لیکن کسی مجبوری کے تحت ارادہ کسی اور کام کا کرنا پڑے۔ گویا ذہن کسی کام کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ارادہ کرنے پر مجبور ہو۔ اگر ایسی صورت حال ہو تو یہ فعل ’’جبر و اکراہ‘‘ کہلاتا ہے اور جبر و اکراہ حالت اضطرار (Extreme Necessity) تک پہنچ جائے تو انسان سے اخلاقی و قانونی ذمہ داری اور جوابدہی مرتفع ہوجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات صحیح معنوں میں مجبور شخص کو سزا نہیں دیتی۔

لہٰذا یہ حالت ''استثنٰی'' (Exception) کی ہوگئی مگر اُصول وکلیہ وہی رہا کہ ہر شخص اپنے آزادانہ انتخابِ نیت کے باعث پابندِ جزا وسزا ہے۔

اس موضوع پر عقائد اسلامی کی کتاب ''شرح عقائد النسفی'' میں بڑی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس بحث کے چند ضروری مقامات حسب ذیل ہیں۔ علامہ تفتازانیؒ فرماتے ہیں:

وللعباد أفعال إختيارية يثابون بها إن كانت طاعة ويعاقبون عليها إن كانت معصية لا كما زعمت الجبرية أنّه لا فعل للعبد أصلا و أن حركاته بمنزلة حركات الجمادات لا قدرة عليها ولا قصد ولا اختيار وهذا باطل لأنّا نفرق بالضرورة بين حركة البطش و حركة الإرتعاش ونعلم أنّ الأوّل باختياره دون الثاني ولأنّه لو لم يكن للعبد فعل أصلا لما صح تكليفه، ولا يترتب استحقاق الثواب والعقاب على إفعاله ولا اسناد الافعال التي تقتضي سابقية القصد والإختيار إليه على سبيل الحقيقة مثل صلّى وكتب وصام بخلاف مثل طال الغلام وأسود لونه. أنّ الله خالق والعبد كاسب وتحقيقه أن صرف العبد قدرته وإرادته إلى الفعل كسب وإيجاد الله تعالىٰ الفعل عقيب ذالک خلق والمقدور الواحد داخل تحت القدرتين لكن بجهتين مختلفتين فالفعل مقدور الله تعالى بجهة الإيجاد ومقدور العبد بجهة الكسب كالأرض تكون ملكا لله تعالى بجهة التخليق وللعباد بجهة ثبوت التّصرف.(۱)

''اور بندوں کو اپنے افعال کا اختیار حاصل ہوتا ہے اس بنا پر اگر یہ افعال

(۱) تفتازانی، شرح عقائد النسفی: ۶۴۔۶۶

طاعت پر مبنی ہوں تو ان کا ثواب ملتا ہے اور اگر معصیت پر مبنی ہوں تو ان پر عذاب دیا جاتا ہے۔ فرقہ جبریہ کا یہ کہنا غلط ہے کہ بندے کو اپنے افعال کا کچھ اختیار ہی نہیں اس کی حرکات وسکنات تو محض جمادات کی حرکات کے مشابہ ہیں جنہیں اپنے افعال پر نہ قدرت حاصل ہوتی ہے اور نہ قصد و اختیار، جس کی وجہ یہ ہے کہ اگر بندے کو اپنے افعال کا اختیار ہی نہیں تو اس کا احکام الٰہی کا مکلّف ٹھہرایا جانا اور اس کا ثواب و عذاب کا مستحق ہونا، نیز افعال کا اس کی طرف منسوب ہونا کس طرح درست ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ان افعال میں حرکت سے پہلے قصد اور اختیار ہوتا ہے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اس نے نماز پڑھی، اس نے لکھا جو اشیاء اس کی قدرت سے باہر ہیں، ان کے متعلق انداز مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ اس نے روزہ رکھا جبکہ لڑکا بڑا ہو گیا یا اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا، افعال کی نسبت بندے کی طرف نہیں کی جاتی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ خالق ہیں اور بندہ اعمال کا کاسب ہے اور تحقیق اس کی اس طرح ہے کہ بندہ اس کام میں اپنی قدرت اور صلاحیت صرف کرتا ہے، لہٰذا یہ کسب ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی کوشش کے بعد اس فعل کو موجود کر دیتا ہے یہ خلق ہے، ایک ہی فعل دو قدرتوں سے وجود میں آتا ہے لیکن دو مختلف جہتوں سے فعل اپنے وجود کے اعتبار سے خدا کا فعل ہے۔ مگر اپنے کسب کے اعتبار سے بندے کا۔ جس طرح زمین تخلیق کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور ثبوتِ تصرف کے اعتبار سے بندے اس کے مالک ہیں۔‘‘

علامہ تفتازانیؒ کی اس بحث سے یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اگرچہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے فعلِ خلق کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوتی ہے لیکن عملی طور پر بندہ اپنے افعال میں کسب کا اختیار رکھتا ہے اور اسی اختیار کی بنیاد پر اپنے ہر عمل کا ذمہ دار اور اس پر جزا و سزا کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

انسان کے مجبور یا مختار ہونے، نیز انسان کے ''اپنے افعال کے کاسب ہونے'' پر گذشتہ باب میں تفصیل سے اظہار خیال کیا جا چکا ہے۔ اس تمام بحث سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہوجاتی ہے کہ انسان اپنے افعال کا کاسب ہے۔ مگر خالق خداوند تعالیٰ کی ذات ہے۔ نیز یہ کہ انسان کو کسبِ اعمال میں اختیار اور ارادے کی آزادی بھی حاصل ہے۔

اس بحث سے ایک نیا مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو اللہ رب العزت کی طرف سے اختیار کی جو دولت عطا کی گئی ہے اس کا پس منظر اور سبب کیا ہے۔ انسان کو آخر مختار کیوں بنایا گیا؟ قرآن مجید میں اس سلسلے میں ایک جامع ارشاد ہے:

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ○(۱)

''تم جو چاہو کرتے رہو وہ (اللہ) تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے○''

اس آیت مبارکہ کے تین الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو مسئلہ تقدیر کے تمام ممکنہ پہلو سامنے آجاتے ہیں اور اس بارے میں پیدا ہونے والے تمام شکوک وشبہات رفع ہو جاتے ہیں۔

۱۔ اِعملوا:۔ (تم عمل کرو) لفظ اعملوا میں عمل کی نسبت انسان کی طرف کی گئی ہے۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان اپنے افعال کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وہ اپنے افعال کے کسب میں مختار ہے۔ اچھے یا برے عمل کرنے کی آزادی رکھتا ہے۔ وہ جس قسم کے اعمال چاہے کرے اور جس قسم کے اعمال سے چاہے احتراز کرے۔ اس پر قدرت کی طرف سے کوئی دباؤ نہیں ڈالا جاتا۔

۲۔ ما شئتم:۔ (جو تم چاہو) ''اعملوا'' کے لفظ سے عملی آزادی اور خود مختاری کا اظہار ہوتا ہے۔ جبکہ ''ما شئتم'' سے فکری، ذہنی اور قلبی آزادی کا ثبوت مہیا ہوتا ہے کہ انسان اپنی ذہنی پسند اور نیت کے انتخاب میں بھی جس قسم کی روش چاہے اختیار کرسکتا ہے۔ وہ نہ

(۱) حم السجدہ، ۴۱: ۴۰

سوچ میں پابند اور مقید ہے اور نہ عمل و کردار میں۔

۳۔ إنّه بما تعملون بصير: اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے جملہ اعمال و افعال کو ذاتِ باری دیکھ رہی ہے تاکہ اسے جزا و سزا بھی دی جا سکے۔ اسے اگرچہ نظری، فکری اور عملی اعتبار سے آزادی اور خود مختاری دی گئی ہے، مگر اس آزادی کے عطا کیے جانے کا مقصد اسے شتر بے مہار کر دینا نہیں، بلکہ اسے یہ احساس دلانا ہے کہ ہر عمل کو اپنے منطقی انجام تک پہنچایا جائیگا اور اُسے اپنی صوابدید کے مطابق کیے ہوئے اعمال پر بارگاہِ ایزدی میں جوابدہ ہونا ہو گا۔ قرآن حکیم کے مطالعے روشنی میں انسان کو آزادی دیئے جانے کے جو مقاصد بیان کئے جا سکتے ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

اللہ تعالیٰ کا تصوّرِ عدل

اللہ تعالیٰ کسی معاملے میں بھی اپنی کسی مخلوق پر ظلم نہیں کرتا۔ اس کا ہر فعل عدل و انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔ اس نے اس کارخانۂ قدرت کو قانونِ عدل پر ہی قائم رکھا ہوا ہے۔ وہ نہ صرف خود عدل و انصاف کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے بلکہ اپنے بندوں کو بھی یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ کسی پر ظلم اور زیادتی نہ کریں۔ چنانچہ سورہ المائدہ میں ارشاد ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ط اِعْدِلُوْا ق هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى۔ (۱)

''اور کسی قوم کی سخت دشمنی (بھی) تمہیں اس بات پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم (اس سے) عدل نہ کرو۔ عدل کیا کرو (کہ) وہ پرہیزگاری سے نزدیک تر ہے۔''

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۔ (۲)

(۱) المائدہ، ۵: ۸

(۲) النساء، ۴: ۵۸

’’اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کیا کرو۔‘‘

عدل کی تعریف علماء لغت نے ان الفاظ میں کی ہے:

وضع الشيء على محله۔[1]

’’کسی چیز کو اس کے صحیح ٹھکانے پر رکھنا۔‘‘

دوسرے لفظوں میں حقدار کو حق دینا، مستحق کو اس کا جائز مقام دینا، عدل ہے۔ جبکہ اس کے برعکس روش اختیار کرنا ظلم و جور ہے۔ قرآن کریم ہر حال اور ہر صورت میں عدل کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ خواہ معاملہ اپنے کسی قریب ترین عزیز حتیٰ کہ ماں باپ کا ہو۔

چنانچہ سورۃ النساء میں ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا۔[2]

’’اے ایمان والو! تم انصاف پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے والے (محض) اللہ کے لیے گواہی دینے والے ہو جاؤ خواہ (گواہی) خود تمہارے اپنے یا (تمہارے) والدین یا (تمہارے) رشتہ داروں کے ہی خلاف ہو اگرچہ (جس کے خلاف گواہی ہو) مالدار ہے یا محتاج، اللہ ان دونوں کا (تم سے) زیادہ خیر خواہ ہے۔ سو تم خواہش نفس کی پیروی نہ کیا کرو کہ عدل سے ہٹ جاؤ (گے)۔‘‘

دوسرے مقام پر عدل و انصاف کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

---

(۱) راغب اصفہانی، مفردات القرآن، بذیل مادہ عدل

(۲) النساء، ۴: ۱۳۵

اِنَّ اللهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی۔[۱]

’’بے شک اللہ (ہر ایک کے ساتھ) عدل اور احسان کا حکم فرماتا ہے اور قرابت داروں کو دیتے رہنے کا۔‘‘

عدل کا مقامِ رفیع ...... احسان

آیہ کریمہ میں عدل کے ساتھ ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ عدل کا مفہوم تو سطورِ بالا میں بیان کیا جا چکا ہے۔ جبکہ احسان کا مقام عدل کے مقام سے بھی بلند ہے۔ حق دار کو اس کا حق دینا عدل ہے۔ اپنا حق کم لینا اور دوسرے کا حق زیادہ دینا احسان ہے۔ گویا احسن جود و فضل اور لطف و کرم کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس طرح نیکی کی زندگی کے دو مدارج بیان کئے گئے ہیں:

پہلا درجہ یہ ہے کہ عدل و انصاف کی زندگی بسر کرو۔ نہ کسی کا حق کھاؤ نہ کسی کو اپنا حق کھانے دو۔ لیکن یہ درجہ بے حد احتیاط کا متقاضی ہے۔ اگر اس درجے سے ذرا بھی قدم لڑکھڑا جائے یعنی معمولی سا بھی افراط و تفریط ہو جائے تو انسان درجۂ ظلم پر پہنچ جاتا ہے اس لئے نیکی اور تقویٰ کے نقطۂ نظر سے ایک بلندتر درجہ بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان خدا تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّ اللهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ○[۲]

’’بے شک اللہ احسان کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے○‘‘

یہ ’’مقامِ احسان‘‘ ہے اس لئے فرمایا: اگر ہو سکے تو عدل کے اونچے درجے پر فائز رہو۔ حق دار کو اس کے حق سے بھی زیادہ دو اور دوسروں کی خاطر اپنا حق لینا چھوڑ دو تاکہ اگر کبھی مقامِ احسان سے اُترنا بھی چاہو تو مقامِ عدل پر تو فائز رہ سکو۔

(۱) النحل، ۱۶: ۹۰

(۲) البقرۃ، ۲: ۱۹۵

جو ذات اپنے بندوں کو ہر حال میں نظامِ عدل و احسان اپنانے کی تلقین کرے، جس کا اپنے بندوں سے یہ مطالبہ ہو کہ جب بھی اپنے یا کسی دوسرے کے متعلق فیصلے کا موقع آئے، تو عدل و انصاف کے اُصولوں کے مطابق فیصلہ کرو۔ وہ ذات جب خود مسند عدالت پر متمکن ہو گی تو کیا اپنے بندوں کے متعلق عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھے گی؟ وہ ذات تو سراسر عدل و انصاف ہے۔ قرآن کریم میں بار بار اللہ رب العزت کے انصاف کا ذکر کیا گیا ہے، سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہے:

وَ نَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ط وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۔ (۱)

’’اور ہم قیامت کے دن عدل و انصاف کے ترازو رکھ دیں گے سو کسی جان پر کوئی ظلم نہ کیا جائے گا، اور اگر (کسی کا عمل) رائی کے دانہ کے برابر بھی ہوگا (تو) ہم اسے (بھی) حاضر کر دیں گے۔‘‘

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ (۲)

’’اور جس جان نے جو کچھ بھی (اعمال میں سے) کمایا ہو گا اسے اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا ○‘‘

ایک دوسرے مقام پر ’’روزِ محشر‘‘ کی منظر کشی کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ اس دن ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق فردِ عمل دی جائے گی۔ مجرمین کو بائیں ہاتھ میں اور نیکوکاروں کو سیدھے ہاتھ میں:

اس موقع پر ارشاد ہو گا:

---

(۱) الأنبياء ۲۱: ۴۷

(۲) آل عمران، ۳: ۲۵

ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتْ یَدٰکَ وَاَنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ○(۱)

’’یہ تیرے ان اعمال کے باعث ہے جو تیرے ہاتھ آگے بھیج چکے تھے اور بے شک اللہ اپنے بندوں پر بالکل ظلم کرنے والا نہیں ہے○‘‘

اللہ تعالیٰ کی احسان پسندی

یہ امر بھی واضح کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کی بجائے جہاں تک ہو سکے گا لطف و کرم اور فضل و احسان کا برتاؤ فرمائے گا۔ اس سلسلے میں ارشاد ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ج وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ○(۲)

’’جو کوئی ایک نیکی لائے گا تو اس کے لیے (بطورِ اجر) اس جیسی دس نیکیاں ہیں اور جو کوئی ایک گناہ لائے گا تو اس کو اس جیسے ایک (گناہ) کے سوا سزا نہیں دی جائے گی اور وہ ظلم نہیں کیے جائیں گے○‘‘

ایک دوسرے مقام پر اس احسان پسندی کا یوں ذکر کیا گیا:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ج وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ○(۳)

’’جو شخص نیکی لے کر آئے گا اس کے لیے اس سے بہتر (صلہ) ہے اور جو شخص برائی لے کر آئے گا تو برے کام کرنے والوں کو کوئی بدلہ نہیں دیا جائے گا مگر اسی قدر جو وہ کرتے رہے تھے۔‘‘

(۱) الحج، ۲۲: ۱۰
(۲) الانعام، ۶: ۱۶۰
(۳) القصص، ۲۸: ۸۴

جس خدا کا اپنے بندوں سے سلوک اور مہربانی کا یہ عالم ہو اس کے متعلق بھلا یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ اس نے انسان کی اچھی یا بری تقدیر لکھ کر اسے مجبور کر دیا ہے۔ نیز اگر اس کے حق میں کوئی برائی لکھی جا چکی ہے تو اس کی مخالفت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

اللہ تعالیٰ اگر بندے کو مجبور کرنا چاہے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا

قرآن کریم اس حقیقت کو خوب اچھی طرح واضح کرتا ہے کہ اگر خداوند تعالیٰ انسان کو مجبور کرنا چاہے تو کوئی اس کو روک نہیں سکتا اور اگر ایسا کیا جاتا تو اس مجبور دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا، چنانچہ فرمایا:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً. (۱)

''اور اگر اللہ چاہتا تو تم (سب) کو ایک ہی امت بنا دیتا۔''

نیز فرمایا:

فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰكُمْ اَجْمَعِيْنَ○ (۲)

''پس اگر وہ (تمہیں مجبور کرنا) چاہتا تو یقیناً تم سب کو (پابندِ) ہدایت فرما دیتا○''

مگر ایسی صورت میں جزا و سزا کا تصوّر بے معنی ہو کر رہ جاتا اور انسان کو کسی جگہ بھی اپنی مرضی چلانے کا اختیار باقی نہ رہتا۔ اس کے برعکس خداوند تعالیٰ نے انسان کو عملی آزادی مرحمت فرمائی اور فرمایا:

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ۔

''جو چاہو، عمل کرو''

---

(۱) النحل، ۱۶: ۹۳

(۲) الانعام، ۶: ۱۴۹

یہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے انسان کے آزاد اور مختار ہونے کی عقلی دلیل ہے۔

جزا و سزا اور نظامِ عدل

یہ امر اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنے کسی بندے پر ادنیٰ درجے کا ظلم بھی گوارا نہیں کرتا۔

اسی سے نظامِ عدل کے ساتھ جزا وسزا کا تعلق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا:

اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ○ (۱)

''بس تمہیں اسی کا بدلہ دیا جائے گا جو کرتے رہے تھے○''

دوسرے مقام پر مزید واضح کیا گیا:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى○ (۲)

''اور یہ کہ انسان کو (عدل میں) وہی کچھ ملے گا جس کی اُس نے کوشش کی ہو گی۔''

ایک اور مقام پر اعلان ہوا:

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ. (۳)

''اس نے جو نیکی کمائی اس کے لیے اس کا اجر ہے اور اس نے جو گناہ کمایا اس پر اس کا عذاب ہے۔''

www.MinhajBooks.com

(۱) التحریم، ۶۶: ۷

(۲) النجم، ۵۳: ۳۹

(۳) البقرۃ، ۲: ۲۸۶

جزا و سزا اور اتمامِ حجت

جزا و سزا کے لئے اللہ رب العزت کا ایک اٹل اُصول ہے کہ وہ اس وقت تک کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کرتا جب تک اتمام حجت نہ کر لے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ○ (۱)

''اور ہم ہرگز عذاب دینے والے نہیں ہیں یہاں تک کہ ہم (اس قوم میں) کسی رسول کو بھیج لیں○''

اس سلسلے کا دوسرا اصول یہ ہے کہ:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى. (۲)

''اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بار (گناہ) نہ اٹھا سکے گا۔''

اسی بنا پر قیامت کے روز ہر شخص خود اپنی فکر میں مبتلا ہوگا۔ چنانچہ سورۂ عبس میں ارشاد فرمایا:

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۝ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ○ (۳)

''اُس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا○ اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے (بھی)○ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے (بھی)○ اس دن ہر شخص کو ایسی (پریشان کن) حالت لاحق ہو گی جو اسے (ہر دوسرے سے) بے پروا کر

(۱) بنی اسرائیل، ۱۷: ۱۵
(۲) الفاطر، ۳۵: ۱۸
(۳) عبس، ۸۰: ۳۴-۳۷

دے گی○‘‘

صرف یہی نہیں بلکہ وہ اس بات پر آمادہ ہو گا کہ اس کی جگہ اس کے تمام متوسلین اور مقربین کو پکڑ لیا جائے اور اس کی جان بخشی ہو جائے۔ چنانچہ سورۃ المعارج میں ارشاد فرمایا:

يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيْهِ○ وَصَاحِبَتِهٖ وَ اَخِيْهِ○ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُؤْيِهِ○ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ يُنْجِيْهِ○(۱)

’’مجرم آرزو کرے گا کہ کاش! اس دن کے عذاب (سے رہائی) کے بدلہ میں اپنے بیٹے دے دے○ اور اپنی بیوی اور اپنا بھائی (دے ڈالے)○ اور اپنا (تمام) خاندان جو اُسے پناہ دیتا تھا○ اور جتنے لوگ بھی زمین میں ہیں، سب کے سب (اپنی ذات کے لیے بدلہ کر دے)، پھر یہ (فدیہ) اُسے (اللہ کے عذاب سے) بچا لے○‘‘

البتہ نیکو کار اور پرہیز گار لوگ اس کلیے سے مستثنیٰ ہوں گے۔ اسی لئے فرمایا:

اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ○(۲)

’’سارے دوست و احباب اُس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے پرہیز گاروں کے (انہی کی دوستی اور ولایت کام آئے گی)○‘‘

بالفاظ دیگر اس روز سبھی پریشان اور متفکر ہوں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے وہ بزرگ و برتر بندے جو دنیا میں بھی دوسروں کی فکر میں غلطاں رہتے تھے اس دن بھی اپنے بجائے دوسروں کی فکر میں مبتلا ہوں گے اور اپنے اپنے درجے اور رتبے کے مطابق خدا تعالیٰ کی بارگاہ سے منصب شفاعت پر سرفراز ہوں گے مگر ان کی شفاعت شفاعت صغریٰ ہو گی جبکہ سب سے بڑی شفاعت سرور کائنات ﷺ کی ہو گی۔

(۱) المعارج، ۷۰: ۱۱-۱۴

(۲) الزخرف، ۴۳: ۶۷

بہر حال جب تک اتمام حجت نہ کر دیا جائے اقوام وملل مبتلائے عذاب نہیں ہوتیں، چنانچہ ایک دوسرے مقام پر ارشاد باری ہے:

وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ۝ (۱)

’’اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم وہاں کے امراء اور خوشحال لوگوں کو (کوئی) حکم دیتے ہیں (تاکہ ان کے ذریعہ عوام اور غرباء بھی درست ہو جائیں) تو وہ اس (بستی) میں نافرمانی کرتے ہیں پس اس پر ہمارا فرمانِ (عذاب) واجب ہو جاتا ہے پھر ہم اس بستی کو بالکل ہی مسمار کر دیتے ہیں۝‘‘

دوسرے لفظوں میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی ضابطے اور کسی قانون کے بغیر کسی قوم کو ہلاک اور برباد کرنے کا اصول کارفرما نہیں بلکہ جس بستی اور اس قوم کی قیادت کی طرف (خواہ مذہبی قیادت ہو یا سیاسی یا اقتصادی) حکم نازل کرتا ہے انہیں اطاعت اور فرمانبرداری کی ترغیب دی جاتی ہے۔ لیکن جب یہ وڈیرے نما لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پروا نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ آخری حد کو بھی عبور کر جاتے ہیں تو پھر ان پر عذابِ خداوندی قہر بن کر ٹوٹ پڑتا ہے اور ان کا نام ونشان صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ کیونکہ جو قوم خود اپنی حالت بدلنا نہ چاہے، خدا تعالیٰ اس کی حالت کو نہیں بدلتا۔ اسی لئے سورۃ الرعد میں ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ (۲)

’’بے شک اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا یہاں تک کہ وہ لوگ اپنے آپ میں خود تبدیلی پیدا کر ڈالیں۔‘‘

(۱) بنی اسرائیل، ۱۷: ۱۶

(۲) الرعد، ۱۳: ۱۱

اتمام حجت کا مفہوم

اتمام حجت کا مفہوم یہ ہے کہ خداوندتعالیٰ لوگوں کے سامنے اپنے احکام کی اطاعت یا خلاف ورزی کے انجام و عواقب کو واضح فرما دیتا ہے۔ انہیں بتا دیا جاتا ہے کہ اطاعت کی صورت میں کیا صلہ اور خلاف ورزی کی صورت میں کیا سزا دی جائے گی۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود کوئی قوم راہ راست پر نہیں آتی تو پھر اس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے حجت تمام ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ اس پر اپنی گرفت مضبوط کر لیتا ہے۔ اسی لئے فرمایا:

لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ۔ (۱)

’’تاکہ (ان) پیغمبروں (کے آجانے) کے بعد لوگوں کے لیے اللہ پر کوئی عذر باقی نہ رہے۔‘‘

ذاتِ خداوندی انسان کی اس قدر سچی خیر خواہ ہے کہ اس پر عذاب نازل کرنے سے پہلے اس کو بار بار فہمائش کرتی ہے، محبت، پیار اور پھر ہلکی پھلکی ڈانٹ ڈپٹ سے اس کے گمراہی کی طرف بڑھنے والے قدموں کو روکنے کی سعی کرتی ہے۔ اُس ذات کا ارشادِ گرامی ہے:

وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ○ (۲)

’’اور ہم ان کو یقیناً (آخرت کے) بڑے عذاب سے پہلے قریب تر (دنیوی) عذاب (کا مزہ) چکھائیں گے تاکہ وہ (کفر سے) باز آجائیں○‘‘

اُس ذات کے متعلق بھلا یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ اس نے انسان کو پیدا ہوتے ہی اپنی ازلی تقدیر کے شکنجے میں جکڑ کر مجبور اور بے بس بنا دیا ہے۔

(۱) النساء، ۴: ۱۶۵

(۲) السجدۃ، ۳۲: ۲۱

اخلاقی جدوجہد

اللہ رب العزت کی طرف سے انسان کو تیسرا تصور اخلاقی جدوجہد کا دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ الملک میں ہے:

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا. (۱)

''جس نے موت اور زندگی کو (اِس لیے) پیدا فرمایا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل کے لحاظ سے بہتر ہے۔''

یعنی اچھے اور برے عمل جانچنے کے لئے کائنات کا یہ سٹیج سجایا گیا، دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ○ ثُمَّ رَدَدْنٰـہُ اَسْفَلَ سٰـفِلِیْنَ○ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ○ (۲)

''بے شک ہم نے انسان کو بہترین (اعتدال اور توازن والی) ساخت میں پیدا فرمایا ہے○ پھر ہم نے اسے پست سے پست تر حالت میں لوٹا دیا○ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو ان کے لیے ختم نہ ہونے والا (دائمی) اجر ہے○''

ایک اور مقام پر ہے:

وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰھَا○ فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَ تَقْوٰھَا○ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا○ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا○ (۳)

(۱) الملک، ۶۷: ۲

(۲) التین، ۹۵: ۴-۶

(۳) الشمس، ۹۱: ۷-۱۰

’’اور انسانی جان کی قَسم اور اسے ہمہ پہلو توازن و درستگی دینے والے کی قَسم○ پھر اس نے اسے اس کی بدکاری اور پرہیزگاری (کی تمیز) سمجھا دی○ بے شک وہ شخص فلاح پا گیا جس نے اس (نفس) کو (رذائل سے) پاک کر لیا (اور اس میں نیکی کی نشو و نما کی)○ اور بے شک وہ شخص نامراد ہوگیا جس نے اسے (گناہوں میں) ملوث کر لیا (اور نیکی کو دبا دیا)○‘‘

ایک اور جگہ اس نکتے کی وضاحت یوں فرمائی:

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ○ (۱)

’’کیا وہ لوگ جنہوں نے برائیاں کما رکھی ہیں یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم انہیں اُن لوگوں کی مانند کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے (کہ) اُن کی زندگی اور ان کی موت برابر ہو جائے۔ جو دعویٰ (یہ کفّار) کر رہے ہیں نہایت برا ہے○‘‘

ان تمام آیات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ خداوند تعالیٰ انسان کو اخلاقی جدوجہد اپنانے کی تلقین فرماتا ہے۔ یہ جبھی ممکن ہے کہ انسان کو آزاد اور خودمختار گمان کیا جائے اور خداوند تعالیٰ انسان کو پیدائشی طور پر اپنی قدرت کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ دے کہ وہ بیچارہ اپنی مرضی سے نہ نیکی کر سکے نہ بدی۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہونے کی صورت میں اس سے جو کوئی نیکی صادر ہوتی ہے یا برائی سرزد ہوتی ہے تو ایسی نیکی کو نیکی اور بدی کو بدی ہرگز نہ کہا جاسکتا۔ اس لئے کہ مجبور آدمی کی نہ نیکی اپنی ہوتی ہے اور نہ بدی۔

اس کی مثال اس طرح سمجھی جاسکتی ہے کہ اگر آپ کسی شخص کے ہاتھ پاؤں

(۱) الجاثیہ، ۴۵: ۲۱

مضبوطی سے باندھ دیں اور اس کو پوری طرح بے بس اور بے دست و پا کرنے کے بعد اسے کہیں کہ وہ آپ کی کسی سابقہ غلطی کو معاف کر دے تو اس حالت میں کیا دنیا کی کوئی عدالت عفو و درگزر کو کوئی اہمیت دے سکتی ہے؟ عفو تو وہی معتبر ہے کہ متعلقہ شخص انتقام لینے یا معاف کرنے پر قادر ہو اور انتقام نہ لے، معاف کر دے۔

گویا مجبوری کی حالت کو ''اضطرار'' تو کہہ سکتے ہیں، نیکی و بدی نہیں قرار دے سکتے۔ چنانچہ جب ہمارے دنیوی قوانین میں مجبوری اور اختیار میں اتنا فرق کیا جاتا ہے اور جبر و اکراہ کی حالت میں کیا ہوا کوئی قول اور ارتکاب کیا ہوا کوئی جرم معتبر نہیں سمجھا جاتا تو اللہ تعالیٰ جس نے فرمانِ نبوی ﷺ کے مطابق تخلیقِ کائنات کے وقت سے یہ فیصلہ کر لیا تھا:

إنّ رحمتي سبقت غضبي.(۱)

''میری رحمت میرے غضب پر غالب رہے گی۔''

اس سے کیونکر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ انسان کی اس بے بسی اور بے چارگی و مجبوری سے غلط فائدہ اٹھائے گا۔ حاشا و کلّا

حالتِ اضطرار اور قانونِ اسلامی

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ حالتِ اضطرار میں شریعتِ اسلامیہ حلال اور حرام کی تفریق اٹھا لیتی ہے اور جان بچانے کی غرض سے مَیتہ اور خنزیر تک کے گوشت کو کھانے کی اِجازت دیتی ہے۔ چنانچہ سورۂ البقرہ میں ہے:

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝(۲)

(۱) بخاری، الصحیح، کتاب التوحید، باب وکان عرشه علی الماء، ۶: ۲۷۰۰، رقم: ۶۹۸۶

(۲) البقرہ، ۲: ۱۷۳

’’اس نے تم پر صرف مردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور وہ جانور جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو حرام کیا ہے، پھر جو شخص سخت مجبور ہو جائے نہ تو نافرمانی کرنے والا ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اس پر (زندگی بچانے کی حد تک کھا لینے میں) کوئی گناہ نہیں، بے شک اللہ نہایت بخشنے والا مہربان ہےo‘‘

اللہ تعالیٰ نے کتنا آفاقی، کائناتی اور عالمگیر تصور دیا ہے کہ حالتِ اضطرار میں حرام تک کو مباح قرار دے دیا، دوسرے مقام پر فرمایا:

وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ.(۱)

’’حالاں کہ اس نے تمہارے لیے ان (تمام) چیزوں کو تفصیلاً بیان کر دیا ہے جو اس نے تم پر حرام کی ہیں، سوائے اس (صورت) کے کہ تم (محض جان بچانے کے لیے) ان (کے بقدرِ حاجت کھانے) کی طرف انتہائی مجبور ہو جاؤ۔‘‘

نیز فرمایا:

فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌo(۲)

’’پھر اگر کوئی شخص بھوک (اور پیاس) کی شدت میں اضطراری (یعنی انتہائی مجبوری کی) حالت کو پہنچ جائے (اس شرط کے ساتھ) کہ گناہ کی طرف مائل ہونے والا نہ ہو (یعنی حرام چیز گناہ کی رغبت کے باعث نہ کھائے) تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہےo‘‘

انہی وجوہ و اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سورۃ الحج میں ارشاد فرمایا:

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ.(۳)

(۱) الانعام، ۶: ۱۱۹
(۲) المائدہ، ۵: ۳
(۳) الحج، ۲۲: ۷۸

’’اور اس نے تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔‘‘

دوسرے مقام پر فرمایا:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا. (۱)

’’اللہ کسی جان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔‘‘

اور حضور سرورِ دو عالم ﷺ نے فرمایا:

بعثت بالحنيفية السّمحة. (۲)

’’مجھے آسان دین دے کر بھیجا گیا ہے۔‘‘

اور اسلام سے قبل کی حالت کی منظر کشی کرتے ہوئے قرآن کریم بیان کرتا ہے:

وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ. (۳)

’’اور اُن سے اُن کے بارِگراں اور طوقِ (قیود) - جو اُن پر (نافرمانیوں کے باعث مسلّط) تھے - ساقط فرماتے (اور انہیں نعمتِ آزادی سے بہرہ یاب کرتے) ہیں۔‘‘

یہ ’’اغلال‘‘ اور ’’اصر‘‘ کیا ہے؟ یہ غلط عقائد اور تصوّرات کی زنجیریں اور توہمات کی بیڑیاں تھیں، جن میں انسانیت کا بند بند جکڑا ہوا تھا، حضور ﷺ کی بعثت کا ایک مقصد انسانیت کو ان زنجیروں اور بندھنوں سے نجات دلانا بھی تھا۔ اسی بناء پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ○ فَكُّ رَقَبَةٍ○ (۴)

(۱) البقرہ، ۲: ۲۸۶

(۲) ۱۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۵: ۲۶۶، رقم: ۲۲۳۴۵

۲۔ طبرانی، المعجم الکبیر، ۸: ۱۷۰، رقم: ۷۷۱۵

(۳) الاعراف، ۷: ۱۵۷

(۴) البلد، ۹۰: ۱۲-۱۳

’’اور آپ کیا سمجھے ہیں کہ وہ (دینِ حق کے مجاہدہ کی) گھاٹی کیا ہے○ وہ (غلامی ومحکومی کی زندگی سے) کسی گردن کا آزاد کرانا ہے○‘‘

بہر حال قرآن نے انسان کو مجبوریوں سے نجات کی راہ دکھائی اس کے لئے سہولتوں کا اعلان کیا۔ جن میں سے ایک حالتِ اضطرار اور حالتِ اختیار کا نمایاں فرق بھی ہے۔

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ارشاد

خلافتِ فاروقی کے زمانے میں حجازِ مقدس میں سخت قحط پڑا۔ اناج مفقود ہوگیا اس حالت میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا پر عمل درآمد روک دیا اور فرمایا: جب تک حکومت ہر شخص کو ضروریاتِ زندگی مہیّا نہیں کرسکتی، وہ قطعِ ید کی حد نافذ کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔ (۱)

سلطنتِ اسلامیہ کا فرض

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس فرمان اور عمل سے قرآن و حدیث کے بیان کردہ اُصول کی پوری طرح وضاحت ہو جاتی ہے، اور یہ قرار پاتا ہے کہ سلطنتِ اسلامیہ کا فرض صرف حدود وتعزیرات کا نفاذ ہی نہیں بلکہ اس کا اصل فرض برائی اور جرم کے مبادیات اور اسباب کا قلع قمع کرنا بھی ہے یعنی چوری، ڈکیتی اور دیگر بیماریوں کے اصلی محرکات کا کھوج لگانا اور پھر اس کو بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکنا اسلامی حکومت کا اوّلین فرض ہے۔

آج کے دور میں اسلامی حدود کو سخت بتایا جاتا ہے، مگر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ان حدود کے عملی نفاذ سے پہلے مملکتِ اسلامیہ میں زندگی گزارنے کے بہتر حالات پیدا کرنے کی ضمانت ملتی ہے۔ اگر تمام ممکنہ سہولتوں کے باجود کوئی شخص بدی کی طرف جھکتا ہے تو وہ واقعی اس قابل ہے کہ اسے سخت سے سخت سزا دی جائے۔

(۱) امام ابویوسف، کتاب الخراج: ۱۴

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک مقدمہ

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں چوری کا ایک مقدمہ سماعت کے لئے پیش ہوا۔صورت حال یہ تھی کہ کچھ ملازموں کو اپنے سرداروں کے اونٹ چرانے کے جرم میں ماخوذ کیا گیا تھا۔ جب مقدمہ چلا تو ان پر چوری پوری طرح ثابت ہوگئی۔ابھی چوری کی سزا پر عمل درآمد نہ ہوا تھا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ انہوں نے ان سرداروں کو بلا بھیجا جن کے پاس وہ لوگ ملازم تھے۔ وہ حاضر ہوئے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اُن سے پوچھا: تم نے کتنی مدّت سے اپنے ان ملازمین کو تنخواہیں نہیں دیں۔ پتہ چلا کہ کافی عرصہ سے ان ملازمین کو تنخواہ نہیں مل رہی تھیں۔اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فیصلہ دیا کہ ان سرداروں سے اُونٹوں کی دوگنا قیمت بطور تاوان وصول کی جائے۔(۱)

ان واقعات سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ اسلام میں مجبوری اور حالتِ اختیار میں نمایاں طور فرق کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ حرام بھی حالتِ اضطرار میں حلال ہو جاتا ہے اور اسے اپنے محبوب کے دین کے لئے بھی اکراہ و جبر گوارا نہیں:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قف قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ. (۲)

’’دین میں کوئی زبردستی نہیں، بے شک ہدایت گمراہی سے واضح طور پر ممتاز ہو چکی ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا دین دیا ہے جس میں کوئی چیز دوسری چیز سے التباس

(۱) مالك، المؤطا، ۲: ۷۴۸، رقم: ۱۴۳۶

(۲) البقرہ، ۲: ۲۵۶

نہیں رکھتی۔ خیر کو شر سے، نیکی کو بدی سے اور بدی کو نیکی سے نیز حالتِ اختیاری کو حالتِ اضطراری سے ممیّز کر دیا گیا ہے۔ اسی بنا پر جب حج جیسے مقدس فریضے کا حکم نازل ہوا تو اس کیساتھ بھی حالتِ مجبوری کا لحاظ رکھا گیا، ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا. (۱)

''اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج فرض ہے جو بھی اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو۔''

ایک صحابی کا سوال اور حضور ﷺ کا جواب

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب حج کا حکم نازل ہوا تو ایک صحابی نے سوال کیا:

أفي كلّ عام يا رسول الله؟

''یا رسول اللہ! کیا یہ حج ہر سال فرض ہے؟''

آپ خاموش رہے، اس نے سوال دہرایا مگر آپ ساکت رہے، اس نے تیسری مرتبہ اپنے سوال کا اعادہ کیا تو پھر بھی آپ خاموش رہے۔ مگر جب سائل کا شوقِ سوال دیکھا تو فرمایا:

لو قلت نعم لوجبت ولمّا استطعتم ثمّ قال: ذروني ما تركتكم فإنّما هلك من كان قبلكم بكثرة سؤالهم. (۲)

(۱) آل عمران، ۳: ۹۷

(۲) مسلم، الصحيح، كتاب الحج، باب فرض الحج مرة في العمر، ۲: ۹۷۵، رقم: ۱۳۳۷

’’اگر میں ہاں کہہ دیتا تو تم پر ہر سال حج واجب ہو جاتا اور تم اس کی ہرگز استطاعت نہ رکھتے۔ پھر فرمایا: لہٰذا جہاں میں خاموش رہوں وہاں تم بھی خاموش رہو کیونکہ تم میں سے پہلی اُمتیں کثرتِ سوال کی وجہ سے ہلاک ہوئی ہیں۔‘‘

خلاصۂ کلام یہ کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ یہ انسان کو آسانیاں اور سہولتیں دینے کے لئے ہے، یہ انسانیت کو تمام بندھنوں اور زنجیروں سے نجات دلانے آیا ہے۔ یہ دین انسان کے جسم سے جبر و اکراہ کا بوجھ اُتارتا ہے، اختیار اور اضطرار میں فرق کرتا ہے۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے سراسر رحمت و رافت اور شفقت و احسان ہے۔ اس سے یہ توقع بھلا کیسے ہوسکتی ہے کہ وہ انسان کو اس کے عمل اور اس کے ہر فعل میں مقید قرار دے گا۔

’’اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اختیارات، اُمورِ خیر میں صرف کرنے کی توفیق بخشے۔ (آمین)

www.MinhajBooks.com

لَا تَاخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ کا معنٰی

"نہ اُس کو اُونگھ آتی ہے اور نہ نیند"

اللہ تعالیٰ کی ذات پر تھکن، اُونگھ یا گہری نیند کا غلبہ نہیں ہوسکتا، نیند کی اِبتدائی حالت یا انتہائی گہری حالت اِس کی مقدس ذات پر غالب نہیں آسکتی۔

اُونگھ اور نیند نہ آنے کی وجہ

اُونگھ اور نیند نہ آنے کا تذکرہ بطور صفاتِ خداوندی کیوں کیا گیا ہے؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ لوگ زندہ اور زندگی کا معنی ومفہوم اِس کائنات کی زندہ اشیاء کے مشاہدے سے حاصل کرتے ہیں اور زندگی کے قوانین کا اندازہ اِسی کُرہ زمین کی زندہ چیزوں کے پیمانے سے کرتے ہیں۔ وہ یہی دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں کہ تمام زندہ موجودات، حیوانات ہوں یا نباتات اور اِنسان اپنی زندگی اور افعالِ زندگانی کے تحفظ و بقا کے لئے نیند اور استراحت و آرام کرنے کے محتاج ہوتے ہیں۔ اگر اُنہیں نیند نہ آئے تو وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں لہٰذا اِس کُرہ ارض کے زندہ موجودات، نباتات یا حیوانات یا اِنسان اِن تمام کے لئے نیند ایک لازمی ضرورت ہے۔

نیند ایک ایسی کیفیت ہے جس پر طاری ہوتی ہے وہ اپنے آپ سے منقطع اور بے خبر ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے فائدے اور نقصان کی تشخیص نہیں کرسکتا۔ وہ اپنے آپ کی آگاہی سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ اِس لئے اللہ تعالیٰ کی ذات سے اِس کی نفی کی گئی ہے۔ اُس کی تمام صفاتِ کمال اور اُس کا ارادہ خود اُس کی ذات سے قائم ہے۔ قیوم خالق

کائنات کی صفتِ دائمی و ابدی ہے اِس کا معنی ہے دوسروں کی حفاظت کرنا یعنی قیوم وہ ہوتا ہے جو ایک طرف سے بذاتِ خود قائم ہوتا ہے اور دوسری طرف سے تمام موجوداتِ عالم اُس کی ذات سے قائم ہوتے ہیں۔ اونگھنا اور سونا یہ سب کچھ اِس عالم طبیعت کے زندہ موجودات کے لئے لازمی ہے۔ اُس نے اپنی ذات سے اُونگھ اور نیند کی ضرورت کو سلب کر کے یہ بات سمجھائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی زندگی اِس کُرہ ارض میں بسنے والے زندہ موجودات کی طرح نہیں ہے۔ اُس کی ذات تمام ایسے عوارض سے منزّہ و مبّرا ہے جو ایک ممکن الوجود مخلوق کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ خالق کائنات تمام مادّی نقائص سے منزّہ و مبّرا ہے اِس لئے وہ نہ تو تھکتا ہے اور نہ کمزور ہوتا ہے اور نہ ہی اُسے تجدیدِ قویٰ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اُس کی ذات کے حریم قدس میں سستی و غفلت کا دخل نہیں ہے۔ آشنائے راز حضرت سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم عرض پرداز ہیں۔

فلسنا نعلم کنه عظمتک إلّا إنّا نعلم إنّک حيّ قيوم لا تأخذک سنة و لا نوم. (۱)

’’بار الہا! ہم تیری عظمت و بزرگی کی حقیقت و کنہ پر آگاہ نہیں ہیں۔ ہم تو صرف اِتنا جانتے ہیں کہ تو زندہ ہے، خود بخود قائم ہے اور سارا جہان تیری ذات کے ساتھ قائم ہے نہ تو تجھے اُونگھ آتی ہے اور نہ ہی تجھ پر نیند غالب آتی ہے۔‘‘

نیند مخلوق کی فطری ضرورت ہے

طبعی نیند کا مطلب دماغ اور سلسلہ اعصاب کو اپنے کام سے روک دینا اور باز رکھنا ہے۔ ہر اِنسان کا دماغ حالتِ بیداری میں اپنے اعصاب کے جال کے ساتھ مسلسل مصروفِ عمل رہتا ہے لہٰذا وہ اِس متواتر دائمی محنت کی وجہ سے تھک جاتا ہے اور کام کرنے

(۱) نہج البلاغة خطبه: ۱۵۹ / شرح ابن الحديد

میں مشکل محسوس کرنے لگتا ہے۔ ذات واجب الوجود نے اپنے حکیمانہ فیصلے اور مدبّرانہ قانون کے مطابق اِنسان کے لئے دن رات میں چند گھنٹے نیند کرنا لازمی قرار دیا ہے، تاکہ ہضم اور تنفس کے علاوہ اِنسان کے بدن کی مشینری کا ایک بہت بڑا حصہ جو کام میں ہمہ تن مصروف تھا وہ بالجبر کام سے رُک جائے، اُس کی تھکاوٹ دور ہو جائے اور وہ دوبارہ کام کے لئے مستعد ہو جائے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

وَّ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًاo[1]

''اور ہم نے تمہاری نیند کو (جسمانی) راحت (کا سبب) بنایا (ہے)o''

امام راغب اصفہانیؒ اِس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

سُباتاً أی قطعاً لِلعمل.

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون کائنات کے ذریعے نیند کو کام کے قطع کرنے اور حالت بیداری کے سارے کاروبار کو تعطیل کرنے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ نیند تجدید قویٰ کا باعث ہے۔ اِنسان اگر نیند کرے تو بیدار ہونے پر نئی طاقت اور تازگی لے کر اُٹھتا ہے۔ نیند اگرچہ تھوڑی مدت کے لئے اور معمولی مقدار میں بھی ہو تب بھی مفید اثر دکھاتی ہے۔ اِس حقیقت کی طرف حضرت سیدنا علی المرتضیٰؓ نے نہایت بلیغ اشارہ فرمایا ہے۔

أربعة القليل منها كثير. النّار القليل منها كثير والنّوم القليل منه كثير والمرض القليل منه كثير والعداوة القليل منها كثير.[2]

''چار چیزیں ایسی ہیں کہ اِن کی معمولی مقدار بھی کثیر ہوتی ہے۔ آگ، نیند، بیماری اور دشمنی اِن چاروں میں سے ہر ایک کی تھوڑی مقدار کو بھی کم نہ سمجھو،

(۱) النباء، ۷۸: ۹

(۲) نہج البلاغۃ خطبہ: ۳۳۷ / شرح ابن الحدید

(بلکہ اِن کی تھوڑی سی مقدار بھی زیادہ ہے اور اِس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ بہت زیادہ اثرات کی بنیاد بن جائے)۔‘‘

قرآن حکیم نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ رات نیند کے لئے اور دن کسبِ معاش کے لئے ہے۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا:

وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ○ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ○ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ○ (۱)

’’اور ہم نے تمہاری نیند کو (جسمانی) راحت (کا سبب) بنایا (ہے) ○ اور ہم نے رات کو (اس کی تاریکی کے باعث) پردہ پوش بنایا (ہے) ○ اور ہم نے دن کو (کسبِ) معاش (کا وقت) بنایا (ہے) ○‘‘

اگرچہ انسان کے لئے زیادہ بہتر تو یہی ہے کہ رات کو نیند کرے اور دن کو محنت سے اپنا کاروبار کرے۔ تاہم اِس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ خود کو مختلف حالات کے ساتھ منطبق کرے۔ اِس بات پر وہ قادر ہے کہ اِس میں تبدیلی کر کے شب و روز کو باہم ملا دے۔ دونوں کے کچھ حصے میں نیند اور کچھ حصے میں کاروبار کرے اور اِس طرح اپنی صحت و زندگی کی حفاظت کرے۔ اس طرف قرآن حکیم نے یوں رہنمائی کی ہے:

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ (۲)

’’اور اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لئے رات اور دن کو بنایا تاکہ تم رات میں آرام کرو اور (دن میں) اس کا فضل (روزی) تلاش کر سکو اور تاکہ تم شکر گزار بنو ○‘‘

(۱) النباء، ۷۸: ۹۔۱۱

(۲) القصص، ۲۸: ۷۳

دوسرے مقام پر اس امر کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ. (۱)

’’اور اس کی نشانیوں میں سے رات اور دن میں تمہارا سونا اور اس کے فضل (یعنی رزق) کو تمہارا تلاش کرنا (بھی) ہے۔‘‘

دن اور رات کو اکٹھا بیان کرنے کی حکمت

اِن دونوں آیات میں دن رات کو اکٹھا بیان کیا ہے اور نیند اور کاروبار کا تذکرہ بھی اکٹھا آیا ہے۔ نیز اِن آیات کا آغاز رحمت اور آیت کے عنوان سے ہوا ہے۔ اِن دو آیات کا مقصد یہی نظر آتا ہے کہ نیند اور کاروبار کے لئے شب و روز دونوں سے ملا جلا استفادہ کرنا بھی ممکن ہے۔ یعنی دن کا کچھ حصہ نیند کرو اور رات کا کچھ حصہ کاروبار کرو یا رات کو کسبِ معاش کرو اور دن کو آرام کرو کہ اِس سے بھی اِنسان کی صحت و زندگی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اِنسان میں تبدیلی کو قبول کرنے اور زندگی کو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ اپنے آپ کو سازگار بنانے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں تمام ممالک میں کاروبار دن رات چلتے ہیں اور چوبیس گھنٹے کام ہوتا رہتا ہے۔ اگر اِنسان کی تخلیق اِس طرح کی ہوتی کہ رات کو نیند کرنا اِس کی زندگی کی بقا و سلامتی کے لئے ضروری ہوتا اور وہ اِس کے بغیر زندہ ہی نہ رہ سکتا تو واضح ہے کہ وہ کبھی ترقی کی شاہراہ پر گامزن نہ رہ سکتا۔ آیت الکرسی ’’معبودِ حقیقی‘‘ کی معرفت کراتے ہوئے اعلان کرتی ہے کہ اونگھ اور نیند اللہ تعالیٰ پر غالب نہیں آسکتی اور سستی و غفلت بھی اُس کی ہستی پر مسلط نہیں ہوسکتی۔ گویا یہ آیت کریمہ بالواسطہ اِنسانوں کو یہ بات سمجھا رہی ہے کہ نیند کی ضرورت اُن زندہ موجودات کو ہوتی ہے جن کا وجود طبیعی مادوں اور معدنی عناصر سے مرکب ہوتا ہے اور اُن کی زندگی مادے کے ساتھ قائم ہوتی ہے۔ لیکن واجب

(۱) الروم، ۳۰: ۲۳

الوجود اللہ تعالیٰ کی ذات چونکہ مادہ سے منزہ ہے۔ اِس کی حیات عین ذات اور مادی عیوب و نقائص سے مبرا ہے۔ اِس لئے اِس کو اُونگھ اور نیند کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کمزور اور ناتواں نہیں ہے کہ نیند کے ذریعے تجدید قویٰ کرے اور صرف شدہ اجزائے جسم کا بدل حاصل کرے۔

''سنۃ'' کو ''نوم'' سے مقدّم کیوں کیا؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیت الکرسی میں ''سنۃ'' کو ''نوم'' سے مقدم کیوں کیا ہے؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ طبیعی نظام میں اُونگھ نیند سے پہلے آتی ہے اور آیت الکرسی میں کلامِ ربانی کا نظم کتاب تکوین کے مطابق ہے۔ اِس لئے پہلے اُونگھ کی نفی کی ہے۔ جو اِبتداً طاری ہوتی ہے اور اِس کے بعد نیند کی نفی کی ہے جو ثانوی عارضے کے طور پر لاحق ہوتی ہے۔ یہاں ایک اہم بلیغ نکتہ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اُونگھ اور نیند ہر دو عادی عوارض میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ ایسی دو حالتیں ہیں جو بالجبر حیوان اور اِنسان پر مسلط ہو جاتی ہیں۔ اِس لئے ''اخذ'' کا لفظ اِستعمال کیا گیا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ پر یہ دونوں حالتیں غالب نہیں آ سکتیں۔ تسلط اور غلبہ کے پیشِ نظر ضعیف سے قویٰ کی طرف ترقی کرنا بہتر ہے اور اِس کے برعکس بلاغت کے منافی ہے۔ غرض آیت الکرسی اِنسانوں کو یہ سمجھا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حیات و قیومیت، رفعت و کمال کے اعلیٰ ترین درجہ پر فائز ہے کہ نہ تو اِس پر اُونگھ غلبہ کر سکتی ہے اور نہ اُسے قیومیت باز رکھ سکتی ہے۔ نہ نیند اُس پر مسلط ہو سکتی ہے جو اُونگھ سے زیادہ قوی ہوتی ہے اور نہ ہی اُسے قیومیت سے مانع ہو سکتی ہے، بلکہ ذات واجب الوجود ہمیشہ ہر جگہ اور ہر موقع پر بذاتِ خود قائم ہے اور ساری کائنات اِس کی ذات کے ساتھ قائم اور موجود ہے۔

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ کا معنٰی

’’جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین ہے سب اسی کا ہے۔‘‘

اِس جملے میں اِنسانوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف اِس کائنات کا ہی قیوم اور برپا کرنے والا نہیں بلکہ آسمان، زمین اور اِن کے اندر کے تمام موجودات اور تمام مخلوقات اُسی کی حقیقی ملکیت ہیں اور وہی اِس جہانِ ہستی کا بالاستحقاق مالک ہے۔ راہِ ہدایت کو گم کرنے والوں اور شرک کی وادی میں بھٹکنے والے لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تمہارا مالکِ حقیقی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ خود ساختہ معبودوں کی نفی کی جا رہی ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ. (۱)

’’بیشک جن (بتوں) کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو وہ بھی تمہاری ہی طرح (اللہ کے) مملوک ہیں۔‘‘

اللہ تعالیٰ کے علاوہ جس کسی کو یا جس چیز کو تم اپنا خدا سمجھ کر پکارتے ہو اور اس کی پرستش کرتے ہو وہ تمہاری طرح بندے اور اس کی مخلوق ہیں۔ پس اے وہ انسانو جو قسم قسم کے معبود بنائے ہوئے ہو اور اپنے حقیقی خدا کے ساتھ عبادت میں انہیں شریک قرار دیتے ہو۔ ذرا ہوش میں آؤ، اپنی عقلی طاقت سے کام لو اور ایک لمحہ بھر سوچو کہ شاید اپنی ان

(۱) الاعراف، ۷: ۱۹۴

قبیح کرتوتوں کو سمجھ لو، اپنی عقل کے ہتھیار سے غلامی و بندگی کی زنجیروں کو توڑ ڈالو اور اپنے آپ کو ان نقلی اور خود ساختہ معبودوں کی قید سے آزاد کرلو۔ ’’لَهُ ما فی السّموات و ما فی الارض‘‘ کے ذریعے انسانوں کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ اِسلام کے مطابق بندگی اور پرستش فقط اس کائنات کو پیدا کرنے والے خداوند قدّوس کے لئے ہے اور وہی تمام افراد اور تمام اشیاء کا حقیقی مالک ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ملکیت پر ایمان فکر کو درست رکھنے میں گہرا اثر ڈالتا ہے

قرآنِ حکیم نے متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ کو مالکِ کائنات بتایا اور آسمانوں اور زمین کے اندر پائی جانے والی تمام اشیاء کو اس پروردگارِ عالم کی ملکیت قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مالکیت پر ایمان فکر انسانی کو درست رکھنے میں گہرا اثر ڈالتا ہے اور کائنات سے متعلق نظریہ قائم کرنے میں انسان کے طرز تفکر میں ایک انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ مومن اس جہان کو لوگوں کے سامنے ایک نئی نظر سے پیش کرتا ہے اور یہ ایمان انسان کو خودسری، سرکشی اور بے راہ روی سے نجات عطا کرتا ہے۔ اس طرح ہر جانب سے حاصل ہونے والا تدبر انسانوں کو ایک صحیح اور سعادت بخش راستے کی سمت لے جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں دو قسم کی آیات ہیں: ایک قسم کی آیات میں آسمان و زمین میں جو کچھ موجود ہے اس کا مالک اللہ تعالیٰ کو بتایا گیا ہے اور آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کی حکیمانہ تدبیر کا بیان صفت ’’قیوم‘‘ کے ذریعے کیا گیا ہے، جبکہ دیگر آیات میں اللہ تعالیٰ کی حکومت و قیومیت کو کلمہ ’’ملک‘‘ کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِط وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ (۱)

’’اور سب آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے (سو تم اپنا دھیان اور توکّل اسی پر رکھو) ○‘‘

---

(۱) آلِ عمران، ۳: ۱۸۹

ایک دوسرے مقام پر اس کی وضاحت یوں فرمائی:

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ط يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ط وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ○(۱)

’’اور آسمانوں اور زمین اور جو (کائنات) ان دونوں کے درمیان ہے (سب) کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے اور اللہ ہر چیز پر بڑا قادر ہے○‘‘

اللہ تعالیٰ نے اپنی ملکیتِ مطلقہ کے مضمون کو بار بار انداز بدل بدل کر بیان کر کے یہ حقیقت ذہن نشین کرائی ہے کہ انسان مطلقا کسی بھی شے کا حقیقی مالک نہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ط وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ○(۲)

’’بیشک اللہ ہی کے لئے آسمانوں اور زمین کی ساری بادشاہی ہے۔ (وہی) جلاتا اور مارتا ہے، اور تمہارے لئے اللہ کے سوا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار (جو امرِ الٰہی کے خلاف تمہاری حمائیت کر سکے)○‘‘

اَلَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا○(۳)

’’وہ (اللہ) کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کے لئے ہے اور جس نے نہ (اپنے لئے) کوئی اولاد بنائی ہے اور نہ بادشاہی میں اس کا کوئی شریک ہے اور

(۱) المائدہ، ۵: ۱۷

(۲) التوبۃ، ۹: ۱۱۶

(۳) الفرقان، ۲۵: ۲

اسی نے ہر چیز کو پیدا فرمایا ہے پھر اس (کی بقا و ارتقاء کے ہر مرحلہ پر اس کے خواص، افعال اور مدت، الغرض ہر چیز) کو ایک مقررہ اندازے پر ٹھہرایا ہےo‘‘

لامِ اختصاص کی حکمت

قرآنِ حکیم میں اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی حکومت مطلقہ، تدبیر حکیمانہ اور بلا قید و شرط فرما روائی کو جو اسے اس پورے جہانِ ہستی پر حاصل ہے۔ کلمہ ’’ملک‘‘ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہ آیات کہ جن میں اللہ تعالیٰ کی ملکیت کی بات کی گئی اور لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ تمام ارضی و سماوی موجودات پروردگار عالم کی ملکیت ہیں۔ ان میں سے اکثر میں یہ مضمون ’’لام اختصاص‘‘ کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔ مثلاً چند ایک قرآنی آیات ملاحظہ کیجئے:

لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ. (۱)

’’جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے سب اللہ کے لئے ہے، وہ باتیں جو تمہارے دلوں میں ہیں خواہ انہیں ظاہر کرو یا انہیں چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔‘‘

وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَاِیَّاکُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ط وَاِنْ تَکْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَکَانَ اللّٰهُ غَنِیًّا حَمِیْدًاo (۲)

’’اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور بیشک ہم

(۱) البقرہ، ۲: ۲۸۴

(۲) النساء، ۴: ۱۳۱

نے ان لوگوں کو (بھی) جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی حکم دیا ہے اور تمہیں (بھی) کہ اللہ سے ڈرتے رہا کرو۔ اور اگر تم نافرمانی کرو گے تو بیشک (سب کچھ) اللہ ہی کا ہے جو آسمانوں میں اور جو زمین میں ہے اور اللہ بے نیاز، ستودہ صفات ہےo"

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط قَدْ یَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَیْهِ ط وَ یَوْمَ یُرْجَعُوْنَ اِلَیْهِ فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ط وَ اللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌo(۱)

"خبردار! جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے (سب) اللہ ہی کا ہے، وہ یقیناً جانتا ہے جس حال پر تم ہو (ایمان پر ہو یا منافقت پر)، اور جس دن لوگ اس کی طرف لوٹائے جائیں گے تو وہ انہیں بتا دے گا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہےo"

وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَسَآؤُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰیo(۲)

"اور اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے تاکہ جن لوگوں نے برائیاں کیں انہیں اُن کے اعمال کا بدلہ دے اور جن لوگوں نے نیکیاں کیں انہیں اچھا اجر عطا فرمائےo"

(۱) نور، ۲۴: ۶۴

(۲) النجم، ۵۳: ۳۱

آیۃ الکرسی اور تصورِ ملکیت

اس طرح کی دیگر بہت سی آیات موجود ہیں کہ جو خداوند عالم کی مالکیت کو بیان کرتی اور تمام ارضی و سماوی موجودات کو خالق عالم کی ملک قرار دیتی ہیں۔

اِنسان اشیاء کا حقیقی مالک نہیں اور اس کی ملکیت ایک اعتباری امر ہے، پرانے زمانے میں انسان کی اجتماعی اور اقتصادی ضروریات کے پیش نظر اس جہان میں انسان کی مالکیت کی بنیاد قائم ہوئی اور انبیاء کرام علیہم السلام نے بھی اس مالکیت کی تصدیق فرمائی۔

انسانی ملکیت کی حدود

ایک پھلدار درخت پر ایک انسان کی مالکیت کی حدود یہ ہیں کہ اگر وہ چاہے تو اسے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ وہ اس کے پھلوں سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ اِن پھلوں کو دوسروں کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہے اور چاہے تو اس درخت کو کاٹ سکتا ہے، لیکن یہ سب حقوق حقیقی مالکیت کا مفہوم نہیں رکھتے۔ اس درخت کا حقیقی اور واقعی مالک اللہ تعالیٰ ہے کہ جس نے اس درخت کے وجود کے تمام ذرّات کو خلق فرمایا ہے یعنی اس درخت کے تمام خلیوں کی زندگی اس ہستی کے فیض کا نتیجہ اور اسی کی عنایات کا اثر ہے۔ چنانچہ اس درخت کا واقعی مالک وہ ہوسکتا ہے جو اس کی زندگی کی حفاظت اور اس کی حیات کی بقاء کے لئے اسے ایک طرف سے غذا حاصل کرنے کی توانائی بخشتا اور ہضم و جذب کی صلاحیت دیتا ہے تو دوسری طرف اس درخت کی غذا کا سامان عالم کے دامن میں تیار کر دیتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ درخت کا مالک حقیقی وہ پروردگار ہے جو اس کے تمام اجزاء کا پیدا کرنے والا ہے۔ انہیں زندگی بخشنے والا ہے اور جس نے اپنی حکیمانہ تدبیر کو تکوینی قوانین کی صورت میں اس درخت کے وجود میں جاری کیا اور اِسے اپنے راہ پر رواں کر رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس جہان ہستی کی ''ملکیت'' اور اس عالم وجود کی مالکیت اس ذات الٰہی لم یزل ولایزال سے مختص

ہے۔ کیونکہ تمام ذرّاتِ عالم اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ اور اس کے فیضانِ کرم کے طفیل موجود ہوئے ہیں۔ یہ کہنا بجا ہے کہ تمام موجودات کا حقیقی اور واقعی مالک اللہ تعالیٰ ہے کہ سارا نظامِ عالم اس ذات کی حکیمانہ تدبیر اور جاری و ساری حکم کے ذریعے باقی اور برقرار ہے۔ یہ کہنا بھی درست ہے کہ اس جہانِ ہستی کا مالک اور فرمان روائی اسی حق تعالیٰ سے مخصوص ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ○ (۱)

''خبردار! (ہر چیز کی) تخلیق اور حکم و تدبیر کا نظام چلانا اسی کا کام ہے۔ اللہ بڑی برکت والا ہے جو تمام جہانوں کی (تدریجاً) پرورش فرمانے والا ہے○''

اللہ تعالیٰ نے اِنسان کو اجازت دی اور اس نے اسے حکم دیا ہے کہ ہر کوئی اپنی زندگی کے تحفظ اور اپنی خوش حالی کی ضمانت کے لئے اس زمین میں موجود تمام اشیاء اور اس کے تمام منابع سے شرعی حدود کے اندر اور مصلحت کے مطابق استفادہ کرے، حالانکہ یہ سب خزانے اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں اور تکوینی قوانین کی مدد سے پروردگارِ عالم ''ملک'' اور حکومت کے تمام ضابطوں کو جاری کئے رکھتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا. (۲)

''اسی نے تمہیں زمین سے پیدا فرمایا اور اس میں تمہیں آباد فرمایا۔''

انسان زمین میں گندم کا بیج ڈالتا ہے اور کچھ عرصے کے بعد اس کی پیداوار سے اپنا سالانہ خرچہ اُٹھا لیتا ہے۔ یاد رہے کہ انسان اپنے اس کام میں بھی ''ملک خدا'' اور ''ملک الٰہی'' ہر دو سے اِستفادہ کرتا ہے۔ گندم، زمین اور پانی یہ سب پروردگار کی ملکیت ہیں کہ جن کو ایک کاشتکار اپنے فائدے کے لئے اِستعمال کرتا ہے۔ لیکن قانون حیات سے

(۱) الاعراف، ۷: ۵۴

(۲) هود، ۱۱: ۶۱

زیرِ زمین دانے کو چیرنا، پودوں کا غذا حاصل کرنا اور نشوونما پانا یہ سب معاملات جو بیج کے پرورش پانے کے عوامل ہوتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے ملک اور حکومت کے قاعدہ قانون میں شامل ہیں کہ جن سے ایک کاشتکار فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اس طرف رہنمائی فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ○ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ○[1]

’’اور بیشک تم نے پہلے پیدائش (کی حقیقت) معلوم کر لی پھر تم نصیحت قبول کیوں نہیں کرتے○ بھلا یہ بتاؤ جو (بیج) تم کاشت کرتے ہو○‘‘

اس آیت کا پہلا حصہ اِنسان کے اشیائے خداوندی سے اِستفادہ کرنے کا بیان ہے جو ہمارے ارادہ و اختیار کے اندر ہے۔ دوسرا حصہ مالکیت خداوندی سے متعلق ہے اور ان تکوینی قوانین سے فائدہ پانے کو بیان کر رہا ہے جو ہمارے اختیار میں نہیں ہیں۔

حکومتِ خداوندی سے فرار ممکن نہیں

الٰہی قوانین سے متعلق اُمور میں اللہ تعالیٰ کے تشریعی قوانین سے بے پرواہی برتنا ایک انسان کے مقدور میں ہے اور وہ اس زمین کی اشیاء سے ناجائز فائدہ اُٹھانے پر قدرت رکھتا ہے۔ بایں طور کہ ان اشیاء کو اس راستے میں اِستعمال کرنے لگے جن کی اجازت پروردگار عالم نے نہ دی ہو۔ لیکن جہاں تک تکوینی قوانین اور اس نظام آفرینش میں جاری الٰہی سنن کا تعلق ہے تو چونکہ وہ حق تعالیٰ کے توانا ارادے اور اس کی قیومیت و حکومت کے ترجمان اور اِس قدر قطعی اور لازم الاجراء ہیں کہ کسی کو قدرت نہیں کہ ان قوانین کے بارے میں اپنی رائے اور اپنے اختیار کو دخل دے سکے، نہ ہی کوئی اس کے مقرر کردہ قوانین سے سرتابی اور انکار کا حق رکھتا ہے کیونکہ ’’ولا یمکن الفرار من حکومتک‘‘ اور تیری حکومت سے فرار ناممکن ہے۔

(۱) الواقعہ، ۵۶: ۶۳۔۶۴

دور حاضر کی علمی و سائنسی ترقی کے باوجود انسان عالم طبیعت کے قوانین کے سامنے مجبور ہے کہ ان کی اطاعت کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے نفاذ کا حصہ ہیں، اس لئے ہر انسان کو اس نظام آفرینش کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔ اگر وہ اپنی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتا ہے اور علمی و عملی مدارج تک ترقی کرنا چاہتا ہے تو اِسے قوانین خلقت سے ہم آہنگی رکھنا پڑتی ہے۔ اس کو یہ قدرت حاصل نہیں کہ ان قوانین کو اپنی خواہش کے مطابق موڑ لے۔

قرآن حکیم کی جن آیات میں اللہ تعالیٰ کی مالکیت کا تذکرہ ہوا ہے، ان کی کثیر تعداد کے آخر میں لوگوں کا نام لیا گیا ہے۔ پھر ایسے جملے لائے گئے جن میں لوگوں کی اچھی یا بری نیت، ان کے اعمال کی جزا یا سزا، ان کے اپنے کئے سے درگزر یا مواخذہ اور اس قسم کے اُمور کو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ اس پوری کائنات کی فرماں روائی اور قیومیت اس ذات الٰہی سے مختص ہے اور لوگوں کو اس معاملے میں مداخلت کا کوئی حق نہیں اور نہ وہ اس میں دخل دینے پر قادر ہیں۔ اس لئے قرآن حکیم کی جس قدر آیات میں ’’ملک خدا اور حکومت الٰہی کو بیان کیا گیا ہے ان سب کے آخر میں اللہ تعالیٰ کی لامحدود قدرت، مخلوقات کی آفرینش، زندگی بخشنا یا موت دینا، بیٹیاں عطا کرنا یا بیٹے دینا اور ایسے اُمور کو لایا گیا ہے جن کا تعلق محض رب العزت سے ہے اور اس میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔

کیا حاکمیت اور قیومیتِ خداوندی تکوینی قوانین کے ذریعے نافذ ہے؟

اللہ تعالیٰ نے اس جہان میں اپنی حاکمیت اور قیومیت کو تکوینی قوانین کے ذریعہ نافذ کیا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان تکوینی قوانین کو وضع کرنے کے بعد وہ اپنے ارادہ و اختیار سلب کرا بیٹھا اور اب ان قوانین کو زیر و زبر کرنے سے عاجز ہوگیا ہے۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے اور اس کی بے قید و شرط حاکمیت اور اس کی لامحدود قدرت ہمارے اس جہان اور دیگر تمام جہانوں کے لئے بلاریب و شک ثابت ہے۔ وہ اگر چاہے

تو ان تکوینی قوانین کی بنیاد کو ہی تبدیل کر کے رکھ دے یا چاہے تو بعض خاص اُمور میں اپنی حاکمیت کا اِستعمال عام طبیعی قوانین سے ہٹ کر کسی دوسرے راستے سے انجام دے دے۔ چنانچہ حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا پتھر سے نکلنا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے آتش نمرود کا گلزار ہونا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصاء کا اژدھا بن جانا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اشارہ پر چاند کے دوٹکڑے ہو جانا، ڈوبے سورج کا واپس پلٹنا، قطرۂ آب سے چشمہ جاری ہو جانا وغیرھم، سب اسی قسم کے اُمور سے تعلق رکھنے والے واقعات ہیں۔ انبیاء و اولیاء، اللہ تعالیٰ سے تقرّب اور کمال بندگی کے نتیجے میں ایسا روحانی مقام پا گئے کہ ولایت تکوینی کے بلند مقام کے اہل ثابت ہوئے۔ یہ اس شان کے لوگ ہیں کہ اگر کسی موقع پر چاہیں تو اللہ تعالیٰ کے اذن اور الٰہی قوت وقدرت کے سہارے تکوینی قوانین کی حدود کو عبور کر جاتے ہیں اور اس جہان کے عمومی قوانین سے برتر کام انجام دے دیتے ہیں مثلاً

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ. (۱)

’’(پھر) ایک ایسے شخص نے عرض کیا جس کے پاس (آسمانی) کتاب کا کچھ علم تھا کہ میں اسے آپ کے پاس لا سکتا ہوں قبل اس کے کہ آپ کی نگاہ آپ کی طرف پلٹے (یعنی پلک جھپکنے سے بھی پہلے)۔‘‘

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہوا:

اَنِّیْ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ. (۲)

’’میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے کی شکل جیسا (ایک پُتلا) بناتا ہوں پھر میں

(۱) النمل، ۲۷: ۴۰

(۲) آل عمران، ۳: ۴۹

اس میں پھونک مارتا ہوں سو وہ اللہ کے حکم سے فوراً اڑنے والا پرندہ ہو جاتا ہے۔‘‘

ان دونوں آیات میں دو نبیوں اور رسولوں کے ولایت تکوینی رکھنے اور تکوینی قوانین کی حدود سے بالاتر افعال یعنی معجزات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا انبیاء کرام اور اولیاء عظام سے باذن الٰہی خارقِ عادت افعال کا ظہور اللہ تعالیٰ کی مشیت، قدرت اور ملکیت و حاکمیتِ مطلقہ کے منافی نہیں، بلکہ یہ بھی اُسی کے نظامِ قدرت کا حصّہ ہیں اور یہ مرضی ومنشائے باری کا نتیجہ ہیں۔

آیت الکرسی میں لهٗ مافی السموات وما فی الارض اور اس طرح کی دیگر آیات کے ذریعے آسمانوں اور زمین کے دائرے میں موجود تمام اشیاء کو خالق و پروردگار کی ملکیت بتایا ہے اور یہ معجزات و کرامات بھی اُسی کی ملکیت ہیں، جو کچھ صادر ہوتا ہے اُس کی مرضی ہی سے ہوتا ہے۔ ذاتاً ومستقلاً کی نفی ہے اور عطاء کا اثبات ہے، بلکہ بنیادی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دینِ اِسلام میں اللہ تعالیٰ کے مالک ہونے کو ایک خصوصی مقام اور اس نکتے کو ایک خصوصی شان حاصل ہے۔

پروردگارِ عالم کی ملکیت پر اعتقاد رکھنا اُصولی اور اساسی مسائل میں سے ہے۔ پھر اسی اعتقاد سے انسان و جہان کی شناخت کے باب میں ایک آدمی کے طرزِ تفکر پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مالکیت پر اعتقاد رکھنے کو انسان سازی اور اِسلامی نظام تعلیم وتربیت کی بنیادوں میں ایک اہم ترین مقام حاصل ہے۔ یہ عقیدہ ایک انسان کی زندگی کے تمام مظاہر پر دور رس اثرات مرتب کرسکتا ہے، اسے خودسری بے راہ روی سے نجات دلا سکتا ہے اور فرض شناسی اور انسانیت کی طرف تحریک کرسکتا ہے۔ اِنسان جو خود بھی ارضی موجودات میں سے ایک ہے اور ’’لهٗ مافی السموات و ما فی الارض‘‘ کا مفہوم اس کو بھی شامل ہے اس لئے مادی اور روحانی ہر دور اعتبار سے ہر زمانہ میں اِنسان زیر بحث رہا ہے۔

مؤمن اور غیر مؤمن کا رویہ

ایک مادہ پرست شخص جب اپنے بارے میں سوچتا ہے تو اس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ وہ ایک مادی مخلوق ہے اور اس عالم طبیعت کے دامن میں اس نابینا و بے شعور مادے سے اتفاقاً وجود میں آ گیا ہے۔ نیز یہ بھی ایک اتفاقی حادثہ ہے کہ اسے عقل، ہوش اور اخلاقی وجدان نصیب ہو گیا اور اسی طرح شہوت، غضب اور دیگر نفسانی خواہشات و رُجحانات کا حصول بھی ایک اچانک واقعہ ہے۔ گویا کہ ان عظیم صلاحیتوں میں سے کوئی ایک بھی کسی حکیمانہ منصوبے کے تحت کسی خالق حکیم کے ارادے سے اسے عطا نہیں ہوئی۔ چنانچہ ایسی فکر رکھنے والا شخص اپنے خالق یعنی اس عالم طبیعت کے سامنے اپنے اندر کوئی احساس ذمہ داری محسوس نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ طبیعت تو ایک بے شعور شے ہے کہ وہ نہ تو ذمہ داری کے سمجھنے پر قادر ہے اور نہ ہی اپنی مخلوق سے کوئی مطالبہ کر سکتی ہے۔ پس نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسا شخص اپنی شہوات اور خواہشات کو پورا کرنے کے لئے اپنے آپ کو ہر قسم کی قید و شرط سے آزاد خیال کرتا ہے۔ یعنی وہ ایک حیوان کی طرح اپنے لذائذ کی کشش کے تحت انہیں پورا کرنے کی کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا مطمح نظر یہی ہوتا ہے کہ ہر ممکن طریقے سے اپنی خواہشات نفسانیہ کو عملی جامہ پہنائے، تاکہ زیادہ سے زیادہ لذت اُٹھائے اور اپنے نفس کو راضی رکھنے کی کوشش کرے۔ ہاں اگر وہ اپنے اوپر کسی پابندی کا قائل ہوتا ہے تو وہ فقط اس ملک کی عدلیہ یا انتظامیہ کی طرف سے مقرر کردہ قوانین و ضوابط کی پابندی ہوتی ہے کہ جس میں وہ زندگی گزار رہا ہے۔ لیکن وہاں بھی لذت طلبی کا حصول کبھی کبھی اسے اس قدر سرکش بنا دیتا ہے کہ وہ ملکی قانون کو بھی توڑ دیتا ہے اور کام و دہن کی لذت حاصل کرنے کے لئے ممنوع افعال کا ارتکاب کر لیتا ہے۔

لیکن ایک خدا پرست انسان اپنے بارے میں غور و فکر کرتا ہے تو اِس نتیجے تک پہنچتا ہے کہ مجھے ایک قادر، عالم اور حکیم خالق نے اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ خلق فرمایا ہے۔ نیز اس نے جہاں مجھے حیوانی لذائذ اور نفسانی خواہشات عطا کی ہیں وہاں مجھے عقل و

ہوش اور اخلاقی وجدان کی نعمت سے بھی مالا مال فرمایا ہے۔ وہ خود سے سوال کرتا ہے کہ کیا میں ایک حیوان کی مانند بلا قید و شرط آزاد ہو سکتا ہوں؟ اگر میرا خالق میرے بارے میں یہی چاہتا ہے کہ حیوان کی طرح زندہ رہوں تو پھر اس نے مجھے اخلاقی وجدان کیوں عطا کیا اور مجھے عقل کیوں دی ہے؟ کیا یہ انسانی سرمایہ کوئی فضول شے ہے؟ کیا وجدان اخلاقی جو میرے وجود کے اندر موجود ہے، وہ بے فائدہ اور لغو ہے؟ کیا یہ اخلاقی وجدان مجھے اس لئے عنایت نہیں کیا گیا کہ سعادت کے حصول میں میری راہنمائی کرے؟ کیا یہ فیصلہ کرنے کی فضیلت میری سرشت میں اس لئے نہیں رکھی کہ میں اپنے حیوانی میلانات کو اس کے سامنے پیش کروں اور پھر اس کے فیصلے پر عمل کروں تاکہ غیر انسانی اور غیر اخلاقی کردار اختیار کرنے سے بچ جاؤں؟ کیا اس ہستی نے مجھے عقل اسی لئے نہیں دی کہ نیکی و بدی کا ادراک کروں اور انسانی فرائض کا پابند اور الٰہی تکالیف کا مکلّف قرار پا سکوں؟

ارشادِ الٰہی ہے:

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی○(۱)

’’کیا اِنسان یہ خیال کرتا ہے کہ اُسے بے کار (بغیر حساب و کتاب کے) چھوڑ دیا جائے گا○‘‘

یعنی اس کے باوجود کہ اسے عقل اور طاقتِ عمل سے مالا مال کیا گیا ہے، کیا خداوند عالم اسے مہمل اور اپنی حالت پر چھوڑ دے گا اور رب العزت اس پر اپنے اوامر و نواہی کی ذمہ داری عائد نہیں کرے گا؟

جو شخص بھی خود کو اللہ کی مخلوق سمجھتا اور اپنی بقاء کو اس کی حکیمانہ تدبیر کا مرہون قرار دیتا ہے، وہ کبھی اس ذات کے اوامر و نواہی کے سامنے خود کو بے تعلق قرار نہیں دیتا۔ وہ جب اس حقیقت بینی اور نورانی فکر تک پہنچ چکا تو اپنے جسم و جان، عقل و وجدان،

(۱) القیامۃ، ۷۵: ۳۶

میلانات حیوانی، بلکہ اپنے وجود کے تمام ذرات کو اپنے محسن خالق کی مخلوق مانتا ہے اور یہی عقیدہ رکھتا ہے کہ وہی میرا خالق اور حقیقی مالک ہے۔ایسا انسان کبھی اپنے مالک حقیقی کے حکم کے خلاف قدم نہیں اُٹھاتا اور گناہ کا ارتکاب کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ اگر کبھی غفلت کے نتیجے میں اس سے کوئی گناہ سرزد ہو بھی جائے تو جب بندگی اور عبودیت کی فکر اس کے اندر بیدار ہوتی ہے اور اسے یاد دلاتی ہے کہ تو اپنے پروردگار کا مملوک ہے اور ایک مملوک بندہ اپنے آقا و مولیٰ کے فرمان کی مخالفت نہیں کرتا۔ تب وہ متنبہ ہو جاتا ہے، اپنی روش تبدیل کر دیتا ہے، اپنے کئے پر پشیمان ہوجاتا ہے اور مستقبل میں گناہ اور مخالفت مولیٰ سے پرہیز کرنے لگتا ہے۔ پس اگر ایک مادی انسان کے طرزِ تفکر اور ایک روحانی انسان کے طرز تفکر کا باہمی موازنہ کیا جائے تو وہ ہمیں اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ مادی طرز فکر کا انسان اپنے اندر احساس ذمہ داری پیدا نہیں کرتا۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو ہر طرف سے آزاد تصور کرتا ہے اور اس کے لئے مشکل ہے کہ اپنے سرکش لذائذ اور آزاد میلانات کو لگام دے اور طبعی رجحانات کی مخالفت کرتے ہوئے خود کو گناہ سے روک لے۔ لیکن ایک مسلمان آدمی چونکہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا بندہ اور مملوک مانتا ہے، اس لئے اپنے ذہن و فکر میں اس کی اطاعت کے جذبے کو پروان چڑھاتا ہے۔ یہ خدا پرست انسان عقیدہ رکھتا ہے کہ اپنے خالق کی فرمانبرداری مجھے اس کی طرف سے جزا کا مستحق بناتی ہے، جبکہ اس کے اوامر کی نافرمانی سزا کا مستوجب قرار دیتی ہے۔ یہی عقیدہ اس کا سبب بنتا ہے کہ وہ اپنی غلط خواہشات سے چشم پوشی کر لیتا ہے اور اپنے اللہ کی خوشنودی کے حصول کے جذبے سے سرشار ہو کر ناجائز خواہشات کو قابو کر لیتا ہے۔

اسلامی تربیت کی اساس

دراصل اِسلام میں تربیت کا نظام ہی اس بنیاد پر اُستوار ہے کہ ہر مسلمان اللہ تعالیٰ کا بندہ اور مملوک ہے۔ اس کے تمام اعضاء بدن اور اس کے اختیار میں دی گئی تمام طاقتیں درحقیقت اسی پروردگار عالم کی ملکیت ہیں۔ ہر مسلمان اس بات کا پابند ہے کہ اپنے

ان اعضاء اور ان طاقتوں کو اپنے خالق کے پسندیدہ اُمور میں اِستعمال کرے اور اپنے خالق کی اس ملکیت سے اس کی رضا کے اندر رہتے ہوئے استفادہ کرے۔ اِسلام نے عالم انسانیت کے لئے جو بنیادی اُصول وضع فرمایا، وہ یہ ہے کہ تمام ارضی و سماوی موجودات پروردگار عالم کی ملکیت ہیں اور اِنسان کو جو خود بھی موجودات ارضی میں سے ایک ہے اور پروردگار کا مملوک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اجازت دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حقیقی ملکیت پر مشتمل تمام موجودات سے شرعی حدود اور مالکِ حقیقی کی رضا کے مطابق استفادہ کرسکتا ہے۔اب اگر کوئی سوال کرے کہ خداوند عالم نے کس حد تک اپنی ملکیت سے فائدہ اُٹھانے کی اجازت دی ہے؟ اور انسان اپنی عقل و خرد کی توانائیوں کے ذریعے عالم طبیعت کے ان ذخائر سے کس حد تک استفادہ کرنے کی قدرت رکھتا ہے؟ مختصر یہ کہ انسان کس حد تک حق رکھتا ہے کہ وہ پروردگار عالم کی ملک میں اپنی سرگرمیوں کو وسعت دے؟ اس سوال کا جواب اِنسان کی صلاحیت کی حدود کو جان لینے سے حاصل نہیں ہوسکتا اور یہ خود خالق انسان اور مالک جہان جانتا ہے۔ وہ خود ہی اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ اس نے ہی انسان میں عقل و ہوش کی استعدادیں پیدا فرمائی ہیں اور اس کی استعداد و قابلیت کی مقدار کو بھی وہ خود ہی سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ انسان کے لئے ان آسمانی اور زمینی اشیاء سے استفادہ کرنے کی حدود معین فرمائے اور اپنی ملکیت سے اس کی بہرہ یابی کا اُصول قائم کرے۔

البتہ قرآن حکیم میں انسان کی قدر و قیمت اور انسان کے مقام کی رفعت کا بیان اس طرح ہوا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍo (۱)

”بیشک ہم نے انسان کو بہترین (اعتدال اور توازن والی) ساخت میں پیدا فرمایا ہےo“

(۱) التین، ۹۵: ۴

اِنسان حامل امانت الٰہی، صاحب عقل و ہوش اور ایک معتدل اور متوازن بدن کا مالک ہے۔ یہ اللہ کی اس قدر اہم مخلوق ہے کہ اس کو پیدا کرنے والے خالق نے اس کی تخلیق پر خود اپنی تعریف کی اور اپنے بارے میں یوں ارشاد فرمایا:

فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ○(۱)

''پھر ہم نے اسے بڑھا (کر محکم وجود بنا) دیا جو سب سے بہتر پیدا فرمانے والا ہے○''

البتہ ملک خدا سے انسان کے فائدے اُٹھانے کی حدود، بیان کرنے میں بھی قرآن حکیم نے گفتگو فرمائی ہے، چنانچہ ارضی موجودات کے بارے میں ارشاد ہوا:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا.(۲)

''وہی ہے جس نے سب کچھ جو زمین میں ہے تمہارے لئے پیدا کیا۔''

اس آیت سے بکمال صراحت معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے انسانوں کو اجازت دی ہے کہ وہ زمین کی سطح اور گہرائی میں موجود تمام معدنیات، تمام دریاؤں، صحراؤں، جنگلوں اور حیوانوں غرض زمین کی تمام موجودات و مخلوقات سے اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق استفادہ کریں۔

ملکیت اور تسخیرِ خداوندی

سماوی موجودات سے انسان کے استفادہ کرنے سے متعلق بھی قرآن حکیم نے وضاحت کی اور انسان کو نوید دی ہے کہ خالق عالم نے اپنے لطف و کرم سے تمام آسمانی اور زمینی محتویات کو انسان اور انسان کے فائدہ اُٹھانے کے لئے مسخّر اور مغلوب بنا دیا ہے۔

(۱) المؤمنون، ۲۳: ۱۴

(۲) البقرہ، ۲: ۲۹

ارشادِ ربّانی ہے:

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللهَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ. (۱)

’’(لوگو!) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے تمہارے لئے ان تمام چیزوں کو مسخّر فرما دیا ہے جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔‘‘

دوسرے مقام پر بیان فرمایا:

وَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ. (۲)

’’اور اُس نے تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب کو اپنی طرف سے (نظام کے تحت) مسخر کر دیا ہے۔‘‘

اللہ نے تمام موجودات جن کو خداوند عالم کی ملکیت قرار دیا گیا ہے وہ سب کی سب انسان کے لئے تسخیر شدہ اشیاء میں بھی ذکر کر دی گئی ہیں۔ چنانچہ آیاتِ تسخیر میں بھی ’’مافی السمٰوٰت وما فی الارض‘‘ کے الفاظ ہیں اور آیات ملکیت خدا میں بھی ’’مافی السموات وما فی الارض‘‘ ’’یا ’’للہ ما فی السموات ومافی الارض‘‘ کے الفاظ ذکر ہوئے ہیں۔ آسمانی اشیاء کی تسخیر کا جو مفہوم ہماری نظر میں جو آتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اَجرامِ فلکی کو انسانوں کی زندگی کے فائدے کے لئے مسخر اور مغلوب کر دیا ہے۔ سورج کی کرنیں جو نباتات اور حیوانات کی پرورش اور ان کی زندگی کی بقاء میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کو کثیر فوائد بخشتی ہیں۔ یہ کرنیں متواتر پڑتی رہتی ہیں اور انسان بھی مختلف شکلوں میں ان کے نور سے استفادہ کرتا رہتا ہے۔ چاند کی قوت جاذبہ دریاؤں اور سمندروں کے مد و جزر میں تنظیم پیدا کرتی ہے، اس کے نور سے تاریک رات روشن ہو جاتی ہے اور انسان اس سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ ستاروں سے لوگ صحراؤں اور دریاؤں میں

(۱) لقمان، ۳۱: ۲۰

(۲) الجاثیہ، ۴۵: ۱۳

راہنمائی حاصل کرتے ہیں اور اسی طرح ارضی موجودات کا ایک وسیع و عریض حصہ انسانوں کی بہرہ یابی کا مورد بنا رہتا ہے۔ ممکن ہے کہ ان اشیاء میں سینکڑوں دیگر ایسے مفادات بھی موجود ہوں جنہیں انسان آج تک سمجھنے پر قادر نہ ہوا ہو۔ مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام اجرامِ فلکی اور آسمانی وُسعتوں میں پائی جانے والی اشیاء کو نوعِ انسانی کے فائدے کے لئے کچھ اس طرح مسخر کر دیا ہے کہ انسان جانے انجانے میں ان کے منافع سے مستفید ہو رہا ہے۔ کیا ہمارے لئے یہ ممکن ہوگا کہ ساوی موجودات کی تسخیر کا مفہوم صرف ان مفادات تک محدود قرار دیں جو غیر اختیاری طور پر ان اشیاء سے حاصل کئے جاتے ہیں؟ کیا انسان کے لئے اجرامِ فلکی کی تسخیر کو اس قدر وسیع معنی میں نہیں لیا جا سکتا جو اختیاری یا غیر اختیاری ہر دو قسم کے منافع کو شامل ہوں اور ان طبیعی ذخائر سے حاصل کئے جانے والے تمام منافع مراد ہوں؟ خداوند عالم نے دریاؤں اور سمندروں کو انسان کے لئے مسخر کیا تاکہ وہ ان کے فوائد سے بہرہ مند ہو۔ ان میں بعض فوائد بلا ارادہ و اختیار ہمیں حاصل ہو جاتے ہیں، مثلاً سورج دریاؤں پر چمکتا ہے تو پانی بخارات بن جاتا ہے۔ وہ فضاؤں میں جا کر بارش برسانے والے بادلوں کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں پھر ہوا کے ذریعے یہ بادل ہماری فضاؤں کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں اور ہمارے کھیت جو سمندروں سے سینکڑوں کلومیٹر دور ہیں یہ بادل وہاں آ کر برستے ہیں۔ وہ ان کھیتوں کو سرسبز و شاداب کر دیتے ہیں کہ جن سے ہماری زندگی کی بقاء و تسلسل کی ضمانت حاصل ہو جاتی ہے۔ ان عوامل میں سے کوئی ایک بھی ہمارے اختیار میں نہیں اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے تحت اس کے مقرر کردہ تکوینی قوانین کے مطابق خود بخود ہوتا رہتا ہے۔ ان غیر اختیاری مفادات کے مقابلے میں انہیں سمندروں کی تسخیر سے ہم اختیاری مفادات حاصل کرنے پر بھی قادر ہیں اور یہ اس مہربان پروردگار کے فیض بیکراں کا نتیجہ ہے۔ ہم اپنی کوشش کے سائے میں ان ذخائر سے بہت زیادہ فائدے اُٹھا لیتے ہیں۔ ان سمندروں کے پانی میں ہماری کشتیاں اور بحری جہاز رواں دواں رہتے ہیں۔ ان کے ذریعے ہماری معاشیات کا پہیہ گھومتا رہتا ہے اور اِسی تجارتی عمل سے ہماری زندگی قائم و دائم ہے۔ یہی حقیقت پروردگار نے یوں بیان فرمائی ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْکُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا ج وَتَرَی الْفُلْکَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ○ (۱)

’’اور وہی ہے جس نے (فضا و بر کے علاوہ) بحر (یعنی دریاؤں اور سمندروں) کو بھی مسخر فرما دیا تاکہ تم اس میں سے تازہ (و پسندیدہ) گوشت کھاؤ اور تم اس میں سے موتی (وغیرہ) نکالو جنہیں تم زیبائش کے لئے پہنتے ہو، اور (اے انسان!) تُو کشتیوں (اور جہازوں) کو دیکھتا ہے جو (دریاؤں اور سمندروں کا) پانی چیرتے ہوئے اس میں چلے جاتے ہیں، اور (یہ سب کچھ اس لئے کیا) تاکہ تم (دور دور تک) اس کا فضل (یعنی رزق) تلاش کرو اور یہ کہ تم شکر گزار بن جاؤ ○‘‘

ایک اور مقام پر اس پر یوں روشنی ڈالی گئی ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَکُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْکُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ○ (۲)

’’اللہ ہی ہے جس نے سمندر کو تمہارے قابو میں کر دیا تاکہ اس کے حکم سے اُس میں جہاز اور کشتیاں چلیں اور تاکہ تم (بحری راستوں سے بھی) اُس کا فضل (یعنی رزق) تلاش کر سکو، اور اس لئے کہ تم شکر گزار ہو جاؤ ○‘‘

آسمانی موجودات سے فائدہ اُٹھانے کو بھی ارضی موجودات کے منافع کی مثل قرار دیا جا سکتا ہے۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ کے تسخیری قانون سے انسان کو غیر اختیاری فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ اسی طرح ممکن ہے کہ انسان اپنی کوشش اور محنت کے ذریعے

(۱) النحل، ۱۶: ۱۴

(۲) الجاثیہ، ۴۵: ۱۲

انہیں اجرامِ فلکی سے کچھ اختیاری منافع حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو جائے۔

انسان نے اَفلاک کی طرف سفر کرنے کا آغاز کر دیا ہے، وہ چاند کے کُرے پر قدم رکھ چکا ہے اور اب وہ زہرہ و مریخ کی تسخیر کے خیال کو پروان چڑھا رہا ہے۔ آج انسان نے خلائی جہاز تیار کر لئے ہیں اور انہیں اس فضاء بسیط میں رواں کر رہا ہے۔ اس وقت زمین سے چاند تک آمد و رفت کر رہا ہے، چاند گاڑی کے ذریعے کرۂ ماہ پر اُتر گیا اور اس کے پتھر لے آیا تاکہ زمین پر ان کی تحقیق و تفتیش کرے۔ اب انسان نے ایک ایسی بیٹری ایجاد کر لی ہے جو سورج کی کرنوں سے توانائی ذخیرہ کر لیتی ہے۔ تاکہ اس کے ذریعے ایک طرف چاند کے سفر میں آلات کو چلایا جا سکے اور دوسری طرف زمین اور چاند کے مابین پیغام رسانی کا رابطہ برقرار رکھا جا سکے۔ پس انسان بیک وقت سورج اور چاند ہر دو سے اختیاری مفادات حاصل کر رہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ آج انسان فضاؤں کی تسخیر میں اپنا ابتدائی قدم اُٹھا چکا ہے اور کچھ حد تک کامیابیاں حاصل کر چکا ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ دو صدیوں میں وہ اس حد تک کامیابیاں حاصل کر لے کہ ہمارا اس وقت ان کا تصور کرنا بھی ناممکن ہو۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ارضی و سماوی ہر دو موجودات کی تسخیر کی نوید ایک ہی آیت میں سنائی اور فرمایا:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ. (۱)

’’اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے وہ سب کچھ تسخیر کر رکھا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔‘‘

چونکہ آسمانوں اور زمین کے سارے موجودات کا مالک اللہ تعالیٰ، اس لئے ان کی تسخیر کا مژدہ انسان کے لئے ایسا پروانہ ہے جو اس جہان کے مالک نے انسان کے فائدے کے لئے صادر فرمایا ہے۔ اس طرح اس نے انہیں اجازت دے دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اشیائے ملکیت میں خود محنت کریں اور رضائے الٰہی کی حدود کے اندر رہتے ہوئے

(۱) الجاثیۃ، ۴۵:۱۳

ان سے خوب خوب فائدہ اُٹھائیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت تکوینی نہ ہوتی تو وسیع و عریض سمندروں میں کشتیاں صدیوں سے تیرنے پر کبھی قادر نہ ہوسکتیں۔ کیونکہ یہ سب سمندر خداوند عالم کی ملکیت ہیں۔ اسی طرح اگر خالق کائنات کی اجازت اور اس کا قانون آفرینش اس طرح کا نہ ہوتا تو آج یہ خلائی راکٹ اس اَمر پر قدرت نہ پاتے کہ اس وسیع فضاء میں پرواز کریں کیونکہ فضائیں بھی حق تعالیٰ کی ملکیت ہیں۔ اگر رب العزت کی اجازت نہ ہوتی تو انسان کے لئے ماضی یا حال میں عمیق دریا میں غوطے لگا کر موتیوں اور مروارید کو نکالنا ممکن نہ ہوتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا تکوینی اذن نہ ہوتا تو آج کا انسان چاند کے کرے پر اُترنے اور وہاں سے پتھر اور کنکر لے کر واپس زمین پر آنے پر قادر نہ ہوتا۔ مختصر یہ کہ انسان ارضی و سماوی موجودات سے متعلق جس قدر کامیابیاں حاصل کر چکا ہے یا مستقبل میں حاصل کرے گا، یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسخیر کر دینے اور اس کے اجازۂ تکوینی کا نتیجہ ہے۔ فرزند آدم طبعی طور پر متجسس پیدا ہوا ہے، اس کی خواہش ہوتی ہے کہ طبعی حوادث کے علل و اسباب سے واقف ہو جائے اور اسے ہر حادثے کی وجہ معلوم ہو جائے۔ انسان کی عقل، فکر، ہوش اور دیگر خداداد صلاحیتیں اس کی جستجو اور تلاش کی خواہش کو پورا کرنے میں بڑی معاون ثابت ہوتی ہیں اور اسرار خلقت پر آگاہی حاصل کرنے میں اس کے کام آتی ہیں۔

انسان ایک لمبے عرصے سے اس کتاب کے مطالعے میں لگا ہوا ہے، اس لئے بہت سے پوشیدہ حقائق کی شناخت حاصل کرنے اور ناشناخت رازوں پر سے پردہ اُٹھانے میں بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ اس طرح ''ملکِ خدا'' میں اس کے تصرفات کی حدود میں بھی اسی قدر وسعت آتی گئی ہے۔ انسان کا یہ مطالعہ کائنات ابھی ختم نہیں ہوا اور اِس کی عملی تحقیقات آگے بڑھ رہی ہیں۔ بہت سی باتیں جو آج تک معلوم نہیں ہیں وہ کل معلوم ہو جائیں گی۔ پس اسی نسبت سے انسان کا زمین و آسمان کی موجودات پر تسلط بھی بڑھتا جائے گا۔ آج کا انسان اپنے علم اور ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر زمین و ہوا اور سمندر کی سطح

عمق پر غلبہ حاصل کر چکا ہے، طبعی ذخائر و معاون پر اختیار حاصل کئے ہوئے ہے اور اب اس کی نگاہیں اجرام فلکی پر لگی ہوئی ہیں۔ انسان زمین میں اللہ تعالیٰ کے ودیعت کردہ گونا گوں خزانوں کو اپنے قبضہ قدرت میں لے چکا ہے، اس ذات کی عطا کردہ تسخیری قوت سے خوب فائدہ اٹھا رہا ہے اور پروردگار کی ملکیت میں اپنی کارگزاریوں کے میدان کو بہت وسیع کر چکا ہے۔ لیکن افسوس کہ انسانوں کی اکثریت نے ملکیت خدا میں تصرف کرنے کے باوجود مالک کو بھلا دیا ہے اور مخلوقات خدا سے فائدہ اُٹھانے کے باوجود خالق کو فراموش کر چکے ہیں۔ کئی انسان تو ایسے بھی ہیں جو اپنی علمی اور صنعتی کامیابیوں پر اس قدر مغرور ہو چکے ہیں کہ نہ صرف یہ کہ خود اپنے خالق کی پرستش وعبادت کی بات تک نہیں کرتے بلکہ دوسرے لوگوں سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کی پوجا کریں اور ان کے سامنے بندگی کا سر جھکائیں۔ دین اِسلام نے انسانوں کو اس کتاب آفرینش کا مطالعہ کرنے اور اس میں غوروفکر کرنے کی تشویق فرمائی اور اس کو اِسلام کی عظیم ترین عبادات میں شمار کیا ہے۔ اِسلام نے لوگوں پر فرض قرار دیا ہے کہ وہ کائنات کے اس حکیمانہ نظام کی معرفت حاصل کرنے میں اپنی عقل اِستعمال کریں۔ وہ اِس منظّم جہان کے اسباب ومسبّبات اور علل و معلولات کے بارے میں غوروفکر کریں تاکہ اس جہان کے اسرار و رموز پر آگاہ ہونے سے ان کے خالق کی قدرت وعظمت پر آگاہ ہو سکیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ۝ (۱)

”اللہ (ہی) ہے جس نے سات آسمان پیدا فرمائے اور زمین (کی تشکیل) میں بھی انہی کی مِثل (تہ بہ تہ سات طبقات بنائے)، ان کے درمیان (نظامِ قدرت کی تدبیر کا) امر اترتا رہتا ہے تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر بڑا قادر

(۱) الطلاق، ۶۵: ۱۲

ہے، اور یہ کہ اللہ نے ہر چیز کا اپنے علم سے احاطہ فرما رکھا ہے۔ (یعنی آنے والے زمانوں میں جب سائنسی اکتشافات کامل ہوں گے تو تمہیں اللہ کی قدرت اور علمِ محیط کی عظمت کا اندازہ ہوجائے گا کہ کس طرح اُس نے صدیوں قبل ان حقائق کو تمہارے لئے بیان فرما رکھا ہے)o"

تصورِ ملکیت

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا کا ہر نظامِ معیشت دراصل "تصورِ ملکیت (Concept of Ownership)" ہی پر قائم ہے۔ تصورِ ملکیت سے اس کے اساسی اصول اور تفصیلات وجزئیات متعین ہوتی ہیں اور اسی سے اس کے نفاذ کی اثر انگیزی اور نتیجہ خیزی متحقق ہوتی ہے۔ لہٰذا تصورِ ملکیت کسی بھی نظامِ معیشت کی تشکیل میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس وقت اقوامِ عالم میں بالعموم سرمایہ دارانہ اور اشتراکی، دو نظام ہائے معیشت رائج اور مقبول ہیں، جنہیں "Capitalistic System of Economy and Socialistic System of Economy" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر ان دونوں نظاموں میں کارفرما "تصورِ ملکیت" کی اصل ہیئت اور فلسفے پر غور کیا جائے تو وہ ایک ہی ہے۔ فرق صرف حدود کے تعین کا ہے۔ پہلے میں ملکیت کی انفرادی حدود میں وسعت کی ضمانت فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ دوسرے میں اجتماعی حدود کی۔ جہاں تک ملکیت کے معنی ومفہوم، اس سے جنم لینے والے حقوق و واجبات اور اس کے قانونی اثرات ولوازمات کا تعلق ہے، وہ یکساں ہیں۔ ان پہلوؤں پر عمیق غور وخوض کے بعد انسان بغیر شک و شبہ کے اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ "تصورِ ملکیت" اپنے مزاج اور خصائص کے اعتبار سے خودغرضانہ اور مفاد پرستانہ رجحان کا حامل ہے۔

اس تصورِ ملکیت سے جو بھی نظامِ معیشت تشکیل پائے گا، اس کی خاصیت مطالبہ حقوق (Demand of Rights) ہو گی، جس کا لازمی نتیجہ انفرادی اور اجتماعی حقوق کے درمیان تصادم ہے۔ اس سے طبقاتی بغاوت اور منافرت میں بھی اضافہ ہوگا اور ملکی پیداوار

بھی بہرصورت متاثر ہوگی۔ حقوق اور مفادات کے اس تصادم کو آج تک دونوں نظام ہائے معیشت میں سے کوئی بھی صحیح طور پر رفع نہیں کر سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ خود غرضانہ ''تصورِ ملکیت'' کے تحت فروغ پانے والے کسی بھی نظامِ معیشت میں اس رجحان کو ختم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اصل خرابی اسی تصور سے نمو پا رہی ہے جو پورے نظام کی بنیاد ہے۔ لہٰذا اس کے ہوتے ہوئے اصلاح کی کوئی بھی تدبیر کارگر ثابت نہیں ہو سکتی۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے بحیثیت نظامِ معیشت دہندہ بنی نوع انسان کو اقتصاد و معیشت کے وہ عظیم انقلابی تصورات اور عملی اصول وضوابط عطا فرمائے جس سے بہتر کوئی تصور، فکر یا فلسفہ معرضِ وجود میں نہیں آ سکتا جس طرح آپ ﷺ کی ذات ستودہ صفات حتمی و ختمی مرتبت ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کے عطا کردہ نظامِ فکر و عمل کا ہر پہلو بھی نقطہ تمامیت اور رتبہ خاتمیت کا حامل ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے تعلیمات کو قرآن و سنت کے روپ میں جس نقطہ کمال تک پہنچا دیا ہے، انسانی فکر و دانش ارتقاء کی تمام منزلوں کو عبور کر کے بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اقبال اس منزلِ آخریں کی نشاندہی ان الفاظ میں کرتا ہے:

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست[1]

ان اعلیٰ تصورات میں سے ایک بنیادی تصور، تصورِ ملکیت (Concept of Ownership) ہے۔ اس کا معنی و مفہوم ایک ایسے نئے انقلابی اسلوب میں متعین کیا گیا کہ جس سے نظامِ معیشت کے مجموعی مزاج اور خصائص میں بڑی بنیادی اور ٹھوس تبدیلی واقع ہو گئی۔ اس تصورِ ملکیت نے اسلام کے نظامِ معیشت کو ان تمام خود غرضانہ اور مفاد پرستانہ رجحانات سے پاک کر دیا، جو اقتصادی اور معاشرتی زندگی کو تباہ کن نتائج سے دوچار کر رہے تھے۔

(۱) اقبال، کلیات (جاوید نامہ): ۶۰۰

۱۔ ملکیت کی لغوی تحقیق

''ملکیت'' عربی اور اردو زبان میں عام مستعمل ہے اس کا مادہ ''ملک'' ہے جس کے معنی بیان کرتے ہوئے علی بن محمد الجرجانی (۷۴۰۔۸۱۶ھ) اپنی کتاب ''التعریفات'' میں لکھتے ہیں:

الملک: حالة تعرض للشيء بسبب ما يحيط به. (۱)

''ایسی حالت جو کسی چیز کو ایسے سبب کے ذریعے پیش آئے جو اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔''

فقہاء کے نزدیک:

الملک: إتصال شرعي بين الإنسان وبين شيء يكون مطلقاً لتصرفه فيه وحاجزاً عن تصرف غيره فيه. (۲)

''الملک ایک شرعی اتصال ہے جو کسی انسان اور ایسی چیز کے درمیان ہو جس میں وہ (انسان) تو تصرف کر سکے لیکن کوئی اور دوسرا اس میں تصرف نہ کر سکے۔''

۲۔ مفہوم ملکیت

کسی چیز کی ملکیت (Ownership) درحقیقت اس چیز میں کسی شخص کے درج ذیل دو حقوق پیدا ہونے سے عبارت ہوتی ہے:

۱۔ حقِ قبضہ (Right of Possession)

۲۔ حقِ تصرف (Right of Disposition)

---

(۱) جرجاني، التعريفات: ۲۸۴

(۲) جرجاني، التعريفات: ۲۸۴

اسی طرح جس شخص کو کسی چیز پر مذکورہ بالا حقوق حاصل ہو جائیں تو اسے چیز کا مالک (Owner) اور اس چیز کو اس کی ملکیت (Property) تصور کیا جائے گا۔ مذکورہ حقوق کے ساتھ ساتھ اس شخص کو اپنی ملک اشیاء کے استعمال، تحفظ، مزید نفع کمانے کے لئے کاروبار میں لگانے اور انتقالِ ملکیت کے حقوق بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔

۳۔ ملکیت کی تعریف

مذکورہ بالا بحث کے تحت ملکیت کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے:

''جب کسی شخص کو کسی مال/ شے پر اپنا قبضہ قائم رکھنے اور حسبِ منشاء تصرف کرنے کا حق حاصل ہو جائے تو اس حق کو ''ملکیت'' کہتے ہیں۔''

۴۔ مالک اور ملکیت میں افادیت کا پہلو

اللہ تعالیٰ نے زمین میں جس چیز کو بھی بقا عطا کی ہے اور اسے محلِ ملکیت (یعنی ملکیت میں آنے کے قابل) بنایا ہے اس کے اندر بنی نوع انسان کیلئے یقیناً کوئی نہ کوئی نفع بخشی، سودمندی اور افادیت (Usufruct) مضمر ہوتی ہے۔

یہ تصور قرآن حکیم کی درج ذیل آیات سے ماخوذ ہے:

۱۔ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا. (۱)

''وہی ہے جس نے سب کچھ جو زمین میں ہے تمہارے لئے پیدا کیا۔''

۲۔ وَ لَقَدْ مَکَّنّٰکُمْ فِی الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَکُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ ط قَلِیْلاً مَّا تَشْکُرُوْنَ○ (۲)

(۱) البقرۃ، ۲: ۲۹

(۲) الاعراف، ۷: ۱۰

’’اور بیشک ہم نے تم کو زمین میں تمکّن وتصرّف عطا کیا اور ہم نے اس میں تمہارے لئے اسبابِ معیشت پیدا کئے، تم بہت ہی کم شکر بجا لاتے ہوo‘‘

۳۔ اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْکَ مِنْ رَّبِّکَ الْحَقُّ کَمَنْ هُوَ اَعْمٰی ط اِنَّمَا يَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِo(۱)

’’بھلا وہ شخص جو یہ جانتا ہے کہ جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے حق ہے، اس شخص کے مانند ہوسکتا ہے جو اندھا ہے، بات یہی ہے کہ نصیحت عقلمند ہی قبول کرتے ہیںo‘‘

۴۔ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ط فَاِنْ طِبْنَ لَکُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَکُلُوْهُ هَنِيْٓئًا مَّرِيْٓئًاo(۲)

’’اور عورتوں کو ان کے مَہر خوش دلی سے ادا کیا کرو، پھر اگر وہ اس (مَہر) میں سے کچھ تمہارے لئے اپنی خوشی سے چھوڑ دیں تو تب اسے (اپنے لئے) سازگار اور خوشگوار سمجھ کر کھاؤo‘‘

۵۔ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَکُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَکُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاکْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًاo(۳)

’’اور تم بے سمجھوں کو اپنے (یا ان کے) مال سپرد نہ کرو جنہیں اللہ نے تمہاری معیشت کی استواری کا سبب بنایا ہے۔ ہاں انہیں اس میں سے کھلاتے رہو اور پہناتے رہو اور ان سے بھلائی کی بات کیا کروo‘‘

سورۃ النساء کی آیت ۵ میں ’’اَمْوَالَکُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَکُمْ قِيٰمًا‘‘ کے الفاظ

(۱) الرعد، ۱۳: ۱۹
(۲) النساء، ۴: ۴
(۳) النساء، ۴: ۵

قابلِ غور ہیں ان میں اموال کی ذاتی خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ یہ انسانی زندگی کے قیام اور اس کی بقا کا باعث ہوتے ہیں یعنی ان میں اس قدر اہم منفعت مضمر ہے کہ ان پر انسانی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ بنابریں باری تعالیٰ نے مال و دولت، ذرائع معیشت اور تمام دنیوی اسباب و وسائل کو ''متاع'' قرار دیا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا:

۶۔ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ○[1]

''تم نیچے اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔ اب تمہارے لئے زمین میں ہی معیّنہ مدت تک جائے قرار ہے اور نفع اٹھانا مقدّر کر دیا گیا ہے○''

کائناتِ انسانی کے اموال میں مضمر عمومی نفع بخشی اور فیض رسانی کی وہ خوبی جس کی بناء پر اسے ''متاع'' قرار دیا گیا ہے۔ لفظ متاع کا معنی نفع اور فائدہ ہے اس لئے زندگی کے تمام اموال کو قرآنی اصطلاح میں ''مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'' کہا جاتا ہے کیونکہ انسان ہر وقت ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

۷۔ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَاٰبِ ○[2]

''لوگوں کے لئے ان خواہشات کی محبت (خوب) آراستہ کر دی گئی ہے (جن میں) عورتیں اور اولاد اور سونے اور چاندی کے جمع کئے ہوئے خزانے اور نشان کئے ہوئے خوبصورت گھوڑے اور مویشی اور کھیتی (شامل ہیں)، یہ (سب) دنیوی زندگی کا سامان ہے، اور اللہ کے پاس بہتر ٹھکانا ہے○''

مال کی اسی ذاتی خصوصیت کے باعث اسے خیر اور فضل سے بھی تعبیر کیا گیا ہے:

(۱) البقرۃ، ۲: ۳۶

(۲) آل عمران، ۳: ۱۴

۸۔ کُتِبَ عَلَیْکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَکَ خَیْرًا.[۱]

’’تم پر فرض ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آئے اگر کچھ مال چھوڑے۔‘‘

۹۔ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌo[۲]

’’اور بے شک وہ مال کی محبت میں بہت سخت ہےo‘‘

۱۰۔ فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللهِ وَاذْکُرُوا اللهَ کَثِیْرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَo[۳]

’’پھر جب نماز ادا ہو چکے تو زمین میں منتشر ہو جاؤ اور (پھر) اللہ کا فضل (یعنی رزق) تلاش کرنے لگو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤo‘‘

۵۔ بالقوہ افادیت اور بالفعل افادیت

ہر شے کے اندر مخفی (Potential) طور پر موجود نفع بخشی اور سود مندی کی یہ خصوصیت جو اللہ تعالیٰ نے اس کی غرض تخلیق کے طور پر پیدا کی ہے جب تک بالفعل ظاہر (Actualise) نہ ہو بنی نوع انسان اس سے کوئی عملی اور حقیقی فائدہ نہیں اٹھا سکتی اس لئے ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ ہر مال (Property) کی بالقوہ افادیت (Potentia Utility) کو بالفعل افادیت (Actual Utility) میں بدلنے کا اہتمام کیا جائے تاکہ اس کی یہ طبعی اور خلقی خصوصیت غیر سودمند، بے جان اور غیر متحرک بن کر نہ پڑی رہے بلکہ اس سے صحیح معنوں میں خلقِ خدا کو فائدہ پہنچے یعنی جس مقصد کے لئے اسے پیدا کیا گیا تھا وہ واقعتاً پورا ہو سکے۔

(۱) البقرۃ، ۲: ۱۸۰

(۲) العادیات، ۱۰۰: ۸

(۳) الجمعۃ، ۶۲: ۱۰

۶۔ علّتِ ملکیت

مذکورہ بالا مقصد ہی حقیقت میں مختلف اشیاء و اموال پر کسی کے حقِ ملکیت کے تسلیم کئے جانے کی اصل علت (Effective Cause) ہے۔ جب تک ان اشیاء و اموال پر کسی کو قبضہ وتصرف کا حق حاصل نہیں ہوجاتا اس پر کوئی محنت نہیں کی جاسکے گی اور جب تک اس پر کوئی منظّم محنت نہ ہوگی اس کی مخفی صلاحیت اجاگر نہیں ہوسکے گی۔ لہٰذا مختلف ذرائع سے کسی شے پر کسی شخص کا حقِ ملکیت اس لئے متحقق ہوتا ہے کہ اس طرح اس شے میں اس کی دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور اس دلچسپی کی بنا پر وہ اسے واقعتاً خلقِ خدا کے لئے نفع بخش اور سود مند بنانے کیلئے تیار ہوتا ہے۔ گویا ''ملکیت'' کسی شے کو انتفاع (فائدہ اٹھانے) کے قابل بنانے کا ذریعہ ہے، اصل مقصود ہرگز نہیں ہے۔ اس لئے شریعت نے مردہ اور غیر آباد زمینوں کو آباد کرنے والے کا حقِ ملکیت تسلیم کیا ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

۱۔ من أحيا أرضاً ميتةً فهي له.(۱)

''جو شخص کسی مردہ زمین کو زندہ کرے وہ اسی کی ملکیت ہوگی۔''

۲۔ من أعمر أرضاً ليست لأحد فهو أحق.(۲)

(۱) ۱۔ أبو داود، السنن، كتاب الخراج والإمارة والفيء، باب في إحياء الموات، ۳: ۱۷۸، رقم: ۳۰۷۳

۲۔ نسائي، السنن الكبرى، ۳: ۴۰۵، رقم: ۵۷۶۱

۳۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۳: ۳۳۸، رقم: ۱۴۶۷۷

(۲) ۱۔ بخاري، الصحيح، كتاب المزارعة، باب من أحيا أرضًا مواتاً، ۲: ۸۲۳، رقم: ۲۲۱۰

۲۔ بيهقي، السنن الكبرى، ۶: ۱۴۱، رقم: ۱۱۵۵۱

’’جس نے کسی زمین کو آباد کیا اور کسی کی نہ تھی تو آباد کرنے والا اس زمین کا مستحق ہوگا۔‘‘

اسی اصول کی بنا پر قرآن مجید میں حکم دیا گیا ہے کہ جن لوگوں کو مال و جائیداد کے صحیح انتظام و انصرام کا شعور نہ ہو، مال و جائیداد ان کے سپرد نہ کرو خواہ وہ فی الحقیقت انہی کے ملکیتی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ اصل مقصود ملکیت یعنی قبضہ و تصرف نہیں بلکہ ان اموال کی افادیت اور نفع بخشی کی صحیح بحالی ہے۔ ارشاد فرمایا گیا:

۱۔ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا○(۱)

’’اور تم بے سمجھوں کو اپنے (یا ان کے) مال سپرد نہ کرو جنہیں اللہ نے تمہاری معیشت کی استواری کا سبب بنایا ہے۔ ہاں انہیں اس میں سے کھلاتے رہو اور پہناتے رہو اور ان سے بھلائی کی بات کیا کرو○‘‘

مستزاد یہ کہ یتیم بچوں کے سرپرستوں کو بھی یہ ہدایت اسی اصول کے تحت دی گئی ہے کہ جب تک وہ بلوغ اور رشد کی صحیح حد کو نہ پہنچیں ان کے ملکیتی اموال ان کے حوالے نہ کرو۔ یعنی ان اموال پر ان کے قبضہ اور تصرف کا حق تب بحال ہوگا جب وہ ان کی اصل افادیت اور نفع بخشی کی صلاحیت کو کماحقہ اجاگر کرنے اور محفوظ رکھنے کے ہو جائیں گے۔

۲۔ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ.(۲)

’’اور یتیموں کی (تربیۃً) جانچ اور آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ نکاح (کی

(۱) النساء، ۴: ۵

(۲) النساء، ۴: ۶

عمر) کو پہنچ جائیں پھر اگر تم ان میں ہوشیاری (اور حُسنِ تدبیر) دیکھ لو تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔‘‘

مذکورہ بالا آیات سے ثابت ہوا کہ افراد کو تفویضِ مال کی شرط مال و جائیداد کے مصالح و منافع کی حفاظت و رعایت کی اہلیت ہے تا کہ ملکیتِ مال کا اصل مقصد یعنی انتفاع کی خصوصیت متاثر نہ ہونے پائے۔

۷۔ حقِ انتفاع کی حقیقت (Usufructuary Right)

اشیاء و اموال سے نفع اٹھانے اور ان سے اپنی ضرورتیں پوری کرنے کا حق (Usufructuary Right) اصلاً تمام بنی نوع انسان میں یکساں طور پر ودیعت کیا گیا ہے لیکن ترتیب میں مالک کا حق قابض و متصرف ہونے کے باعث دوسروں پر مقدم ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی قرآن مجید نے مال و جائیداد کے مالکوں کو ان کے اپنے ملکیتی اموال میں سے دوسروں یعنی غیر مالکوں کو فائدہ پہنچانے کا حکم دیا ہے تو مستحقین کے انتفاع کو بطورِ حق (Lawful Right) بیان کیا گیا ہے خواہ وہ اقرباء ہوں یا یتامٰی و مساکین، سائلین ہوں یا محرومین۔ قرآن مجید مالداروں کے مال میں محرومین اور مستحقین کا حق تسلیم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انہیں ان کا حق ادا کرو۔ ارشادِ ربّانی ہے:

۱۔ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِo[1]

’’اور ان کے اموال میں سائل اور محروم (سب حاجتمندوں) کا حق مقرر تھاo‘‘

۲۔ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌo لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِo[2]

’’اور وہ (ایثار کیش) لوگ جن کے اَموال میں حصہ مقرر ہےo مانگنے والے

(۱) الذاریات، ۵۱: ۱۹

(۲) المعارج، ۷۰: ۲۴، ۲۵

اور نہ مانگنے والے محتاج کا○"

۳۔ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ط ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ○(۱)

"پس آپ قرابت دار کو اس کا حق ادا کرتے رہیں اور محتاج اور مسافر کو (ان کا حق)، یہ ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو اللہ کی رضامندی کے طالب ہیں، اور وہی لوگ مراد پانے والے ہیں○"

۴۔ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا○(۲)

"اور قرابتداروں کو ان کا حق ادا کرو اور محتاجوں اور مسافروں کو بھی (دو) اور (اپنا مال) فضول خرچی سے مت اڑاؤ○"

مستزاد یہ ہے کہ لینے والے کا حق اتنا ہی ضروری اور پاکیزہ ہے جتنا کہ دینے والے کا اپنا حق۔ یعنی مستحق افراد کا حق مالک کے حق سے کسی لحاظ سے کمتر یا گھٹیا نہیں ہے۔

۵۔ ارشاد فرمایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ. (۳)

"اے ایمان والو! ان پاکیزہ کمائیوں میں سے اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا ہے (اللہ کی راہ میں) خرچ کیا کرو اور اس میں

(۱) الروم، ۳۰: ۳۸
(۲) بنی اسرائیل، ۱۷: ۲۶
(۳) البقرۃ، ۲: ۲۶۷

سے گندے مال کو (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے کا ارادہ مت کرو کہ (اگر وہی تمہیں دیا جائے تو) تم خود اسے ہرگز نہ لو۔‘‘

یہاں دیگر مستحقین کا حقِ انتفاع اصلاً مالک کے حقِ انتفاع کے برابر قرار دیا گیا ہے اور کسی کے حق کو دوسرے کے حق پر ماہیۃً ترجیح نہیں دی گئی۔ ہاں ترتیب میں ترجیح ضرور موجود ہے۔

۶۔ حقِ انتفاع کے برابر ہونے کا ذکر ایک اور مقام پر یوں کیا گیا ہے:

وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ط سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ○ (۱)

’’اور اُس کے اندر (سے) بھاری پہاڑ (نکال کر) اس کے اوپر رکھ دیئے اور اس کے اندر (معدنیات، آبی ذخائر، قدرتی وسائل اور دیگر قوتوں کی) برکت رکھی، اور اس میں (جملہ مخلوق کے لئے) غذائیں (اور سامانِ معیشت) مقرر فرمائے (یہ سب کچھ اس نے) چار دنوں (یعنی چار ارتقائی زمانوں) میں مکمل کیا، (یہ سارا رِزق اصلاً) تمام طلب گاروں (اور حاجت مندوں) کے لئے برابر ہے○‘‘

امام زمخشری (م ۵۲۸ھ) اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

قدر فيها الأقوات لأجل الطالبين لها المحتاجين إليها من المقتاتين. (۲)

’’اللہ تعالیٰ نے اس (زمین) میں ضرورت مندوں، محتاجوں اور محنت کشوں کے لئے رزق مقدر کر دیا ہے۔‘‘

(۱) حٰمٓ السجدة، ۴۱: ۱۰

(۲) زمخشري، الكشاف، ۴: ۱۸۷

سائلین کا یہی مفہوم تفسیر بحر المحیط، روح المعانی اور الجواھر میں بھی بیان ہوا ہے، الزجاج نے بھی اسی معنی کو اختیار کیا ہے۔

۸۔ حقِ تملّک کی حقیقت (Proprietary Right)

انسان فطری طور پر اپنی ضروریات کو پورا کرنا چاہتا ہے خصوصی طور پر زندگی کے بنیادی لوازمات خوراک، تن پوشی، رہائش و دیگر دنیاوی احتیاجات سے نمٹنے کے لئے اسے روپے پیسے کی ضرورت پڑتی ہے جس کے لئے وہ اکتسابِ مال کے لئے سعی و کوشش کرتا ہے۔ مال کمانا، اسے صرف کرنا اور جمع رکھنے کی خواہش بھی کرتا ہے۔ دینِ اسلام کی یہ خوبی ہے کہ اس نے اپنے ماننے والوں میں اپنی تعلیمات کی (حدود وقعود) کے ساتھ آزادی دی ہے۔ اس طرح فرد کی انفرادی اور اجتماعی ملکیت کے امور کو تسلیم کیا ہے۔

(ا) حقِ تملّک قرآن مجید کی روشنی میں

قرآنِ مجید میں بیان کردہ حقِ ملکیت کی وضاحت درج ذیل آیات سے کی جاسکتی ہے:

۱۔ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ٥ (۱)

''اور تم بے سمجھوں کو اپنے (یا ان کے) مال سپرد نہ کرو جنہیں اللہ نے تمہاری معیشت کی استواری کا سبب بنایا ہے۔ ہاں انہیں اس میں سے کھلاتے رہو اور پہناتے رہو اور ان سے بھلائی کی بات کیا کرو ٥''

۲۔ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ. (۲)

(۱) النساء، ۴: ۵

(۲) سبا، ۳۴: ۱۵

’’تم اپنے رب کے رزق سے کھایا کرو اور اس کا شکر بجالایا کرو۔‘‘

۳۔ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○(۱)

’’تم ہلکے اور گراں بار (ہر حال میں) نکل کھڑے ہو اور اپنے مال و جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم (حقیقت) آشنا ہو○‘‘

۴۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ط ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ○(۲)

’’اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو، یہاں تک کہ تم ان سے اجازت لے لو اور ان کے رہنے والوں کو (داخل ہوتے ہی) سلام کہا کرو یہ تمہارے لئے بہتر (نصیحت) ہے تاکہ تم (اس کی حکمتوں میں) غور و فکر کرو○‘‘

۵۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ج وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ج لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ○(۳)

’’پھر اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف سے اعلانِ جنگ پر خبردار ہو جاؤ اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے لئے تمہارے اصل مال (جائز) ہیں، نہ تم خود ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے○‘‘

۶۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ

(۱) التوبۃ، ۹: ۴۱
(۲) النور، ۲۴: ۲۷
(۳) البقرۃ، ۲: ۲۷۹

وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ط وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ○(۱)

''اور ہم ضرور بالضرور تمہیں آزمائیں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے، اور (اے حبیب!) آپ (ان) صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیں○''

۷۔ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○(۲)

''اور وہ (ایثار کیش) لوگ جن کے اَموال میں حصہ مقرر ہے ○ مانگنے والے اور نہ مانگنے والے محتاج کا○''

۸۔ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ج فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ج وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ط وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ج وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ط فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ط وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ○(۳)

''اور یتیموں کی (تربیۃً) جانچ اور آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ نکاح (کی عمر) کو پہنچ جائیں پھر اگر تم ان میں ہوشیاری (اور حُسنِ تدبیر) دیکھ لو تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو، اور ان کے مال فضول خرچی اور جلد بازی میں (اس اندیشے سے) نہ کھا ڈالو کہ وہ بڑے ہو (کر واپس لے) جائیں گے، اور جو کوئی خوشحال ہو وہ (مالِ یتیم سے) بالکل بچا رہے اور جو (خود) نادار ہو اسے (صرف) مناسب حد تک کھانا چاہئے، اور جب تم ان کے مال ان کے سپرد کرنے لگو تو ان پر گواہ بنا لیا کرو، اور حساب لینے والا اللہ ہی کافی ہے○''

(۱) البقرۃ، ۲: ۱۵۵

(۲) المعارج، ۷۰: ۲۴، ۲۵

(۳) النساء، ۴: ۶

۹۔ وَّ اٰتُوۡهُمۡ مِّنۡ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیۡۤ اٰتٰكُمۡ.[۱]

’’اور تم (خود بھی) انہیں اللہ کے مال میں سے (آزاد ہونے کے لئے) دے دو جو اس نے تمہیں عطا فرمایا ہے۔‘‘

۱۰۔ اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّا خَلَقۡنَا لَهُمۡ مِّمَّا عَمِلَتۡ اَيۡدِيۡنَاۤ اَنۡعَامًا فَهُمۡ لَهَا مٰلِكُوۡنَ○[۲]

’’کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اپنے دستِ قدرت سے بنائی ہوئی (مخلوق) میں سے اُن کے لئے چوپائے پیدا کیے تو وہ ان کے مالک ہیں○‘‘

۱۱۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡكُلُوۡۤا اَمۡوَالَكُمۡ بَيۡنَكُمۡ بِالۡبَاطِلِ.[۳]

’’اے ایمان والو! تم ایک دوسرے کا مال آپس میں ناحق طریقے سے نہ کھاؤ۔‘‘

۱۲۔ لَتُبۡلَوُنَّ فِیۡۤ اَمۡوَالِكُمۡ وَ اَنۡفُسِكُمۡ.[۴]

’’(اے مسلمانو!) تمہیں ضرور بالضرور تمہارے اموال اور تمہاری جانوں میں آزمایا جائے گا۔‘‘

(۲) حقِ تملّک احادیث کی روشنی میں

قرآنی آیات کی طرح احادیثِ نبوی ﷺ میں بھی حقِ ملکیت کا جو تصور ملتا ہے۔ وہ درج ذیل ارشاداتِ نبوی ﷺ سے واضح ہو جاتا ہے:

۱۔ من أحيا أرضاً ميتةً فهي له.[۵]

(۱) النور، ۲۴: ۳۳

(۲) یٰس، ۳۶: ۷۱

(۳) النساء، ۴: ۲۹

(۴) آل عمران، ۳: ۱۸۶

(۵) ۱۔ ترمذي، السنن، كتاب الأحكام عن رسول الله ﷺ، باب ما ذكر في إحياء ——

’’جو شخص کسی مردہ زمین کو زندہ کرے وہ اسی کی ملکیت ہوگی۔‘‘

۲۔ من أعمر أرضاً ليست لأحد فهو أحق.(۱)

’’جس نے کسی زمین کو آباد اور کسی کی نہ تھی تو آباد کرنے والا اس زمین کا مستحق ہوگا۔‘‘

۳۔ من سبق إلى ماء لم يسبقه إليه مسلم فهو له.(۲)

’’جو شخص ایسے چشمہ کی طرف سبقت کرے جس کی طرف کسی نے سبقت نہیں کی تو وہ اس کی ملکیت تصور ہوگا۔‘‘

..... أرض الموات، ۳: ۲۶۲، رقم: ۱۳۷۸

۲۔ أبو داود، السنن، كتاب الخراج والإمارة والفيء، باب في إحياء الموات، ۳: ۱۷۸، رقم: ۳۰۷۳

۳۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۳: ۳۳۸، رقم: ۱۴۶۷۷

۴۔ ابن حبان، الصحيح، ۱۱: ۶۱۶، رقم: ۵۲۰۵

۵۔ نسائي، السنن الكبرى، ۳: ۴۰۵، رقم: ۵۷۶۱

۶۔ بيهقي، السنن الكبرى، ۶: ۹۹، رقم: ۱۱۳۱۸، ۱۱۳۱۹

۷۔ مقدسي، الأحاديث المختارة، ۳: ۲۹۷، ۲۹۸، رقم: ۱۰۹۶، ۱۰۹۸

(۱) ۱۔ بخاري، الصحيح، كتاب المزارعة، باب من أحيا أرضًا مواتًا، ۲: ۸۲۳، رقم: ۲۲۱۰

۲۔ بيهقي، السنن الكبرى، ۶: ۱۴۱، رقم: ۱۱۵۵۱

۳۔ عسقلاني، الدراية في تخريج أحاديث الهداية، ۲: ۲۴۴، رقم: ۹۸۴

(۲) ۱۔ أبو داود، السنن، كتاب الخراج والإمارة والفيء، باب في إقطاع الأرضين، ۳: ۱۱۷، رقم: ۳۰۷۱

۲۔ بيهقي، السنن الكبرى، ۱۰: ۱۳۹

۳۔ ابن سعد، الطبقات الكبرىٰ، ۷: ۷۳

۴۔ عيني، عمدة القاري، ۱۲: ۱۷۵

(۳) حقِ تملّک : فقہ اسلامی میں

تمام مذاہبِ فقہ میں فرد کے حقِ ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے اس ضمن میں باقاعدہ قوانین بنائے گئے ہیں مثلاً:

- ☆ قانونِ زکوٰۃ وعشر وصدقات
- ☆ قانونِ وراثت
- ☆ قانونِ نفقات/کفالت
- ☆ قانونِ وصیت
- ☆ قانونِ اجرت وغیرہ

مذکورہ بالا قواعد وقوانین کی تفصیل بمعہ امثلہ وعملی تنفیذ باب ''اسلامی معاشی نظام کی تنفیذ'' میں بیان کی گئی ہے۔

۹۔ انفرادی حقِ ملکیت

اسلام نے انفرادی ملکیت کا جو حق انسان کو دیا ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۱۴۔۱۱۷۶ھ) لکھتے ہیں:

أن الله تعالى لما خلق الخلق وجعل معايشهم في الأرض وأباح لهم الانتفاع بما فيها وقعت بينهم المشاحة والمشاجرة فكان حكم الله عند ذلك تحريم أن يزاحم الإنسان صاحبه فيما اختص به لسبق يده إليه أو يد مورثه أو لوجه من الوجوه المعتبرة عندهم إلا بمبادلة أو تراض معتمد على علم من غير تدليس وركوب غرر، وأيضاً لما كان الناس مدنيين بالطبع لاتستقيم معايشهم إلا

بتعاون بينهم نزل القضاء بإيجاب التعاون وأن لا يخلو أحد منهم مماله دخل في التمدن إلا عند حاجة لا يجد منها بداً۔ (۱)

’’اللہ تعالیٰ نے جب زمین پر اپنی مخلوق پیدا کی تو ان کی معاش اور روزی بھی اسی (زمین پر) مقدر فرمائی اور زمین کی پیداوار سے ان کے لئے انتفاع مباح کیا اور چونکہ حرص کی وجہ سے ان کے درمیان نزاع پیدا ہوا تو اس وقت اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہوا کہ کوئی شخص دوسرے کی مخصوص و مختص چیز میں کسی قسم کی مزاحمت و مداخلت نہ کرے اور یہ اس کی مخصوص چیز اس طرح ہو گی کہ اس چیز پر سب سے پہلے اس کا قبضہ ہوا ہے یا اس کے کسی مورث کا قبضہ تھا یا کسی ایسے طریقے سے اس چیز پر اس کا جو ان لوگوں میں مجموعی طور پر قبضہ اور ملکیت کے لئے معتبر مانا جاتا ہے اس قسم کے قبضہ اور ملکیت میں سوائے تبادلہ اور سوچ سمجھ کر بلا کسی فریب اور دھوکہ اور قابل اعتماد باہمی رضامندی کے کسی قسم کی مزاحمت کرنا حرام اور ناجائز ہے۔‘‘

۱۰۔ حقِ ملکیت کی صحت ومشروعیت کی شرائط

اشیاء واموال پر افراد کا حقِ ملکیت قطعاً غیر مشروط نہیں ہے بلکہ وہ اس شرط کے ساتھ تسلیم کیا گیا ہے کہ اموال کے مقررہ حقوق پورے کئے جائیں اور اموال کے مقررہ حقوق یہ ہیں کہ دوسروں کو بھی ان کے منافع میں شریک کیا جائے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

۱۔ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۝ (۲)

’’اور اُن کے اموال میں سائل اور محروم (سب حاجتمندوں) کا حق مقرر تھا۝‘‘

(۱) شاه ولي الله، حجة الله البالغه، ۲: ۱۰۳

(۲) الذاريات، ۵۱: ۱۹

۲۔ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ (۱)

’’اور وہ (ایثار کیش) لوگ جن کے اَموال میں حصہ مقرر ہے ○ مانگنے والے اور نہ مانگنے والے محتاج کا ○‘‘

۳۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إن في المال حقاً سوى الزكاة. (۲)

’’بیشک مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حقوق ہیں۔‘‘

۴۔ جب تک مملوکہ مال کا حق مکمل طور پر ادا نہ کیا جائے اس کی ملکیت نہ صرف ناجائز رہتی ہے بلکہ عذابِ آخرت کا باعث بن جاتی ہے، ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

ما من صاحب كنز لا يؤدي حقه إلا جعله الله يوم القيامة يحمى عليها في نار جهنم فتكوى بها جبهته وجنبه وظهره. (۳)

’’جس شخص کے پاس کوئی مال ہے اور وہ اس مال کی زکوٰۃ نہیں دیتا تو قیامت کے دن دوزخ کی آگ میں اس مال کو گرم کر کے اس شخص کی پیشانی، پسلی، پیٹھ داغے جائیں گے۔‘‘

---

(۱) المعارج، ۷۰: ۲۴، ۲۵

(۲) ۱۔ ترمذي، السنن، كتاب الزكاة، باب ما جاء أن المال حقاً سوى الزكاة، ۳: ۴۸، رقم: ۶۶۰

۲۔ دارقطني، السنن، ۲: ۱۲۵

۳۔ سعيد بن منصور، السنن، ۵: ۱۰۰، رقم: ۹۲۶

(۳) ۱۔ أبو داود، السنن، كتاب الزكاة، باب في حقول المال، ۲: ۱۲۴، رقم: ۱۶۵۸

۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲: ۲۶۲، رقم: ۷۵۵۳

۳۔ بيهقي، شعب الإيمان، ۳: ۱۹۰، رقم: ۳۳۰۲

اس سے ثابت ہوا کہ اسلام اموال کی ملکیت کو بلا شرط اور بلا قید تسلیم نہیں کرتا بلکہ اس کا جواز اور استحقاق صرف مقررہ حقوق کو پورا کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔

۵۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اموال مملوکہ کا استعمال ان شرائط اور قیود کے تحت کرتے تھے:

كان ابن عمر رضی اللہ عنہما لا يأكل حتى يؤتي بمسكين يأكل معه. (۱)

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ جب تک کوئی حاجت مند مل کر کھانا نہ کھاتا، آپ کھانا تناول نہ فرماتے تھے۔''

۶۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

كنا نعد الماعون على عهد رسول اللہ ﷺ همام الدلو و القدر. (۲)

''ہم عہدِ رسالت مآب ﷺ میں ڈول اور ہنڈیا تک کا عاریتاً ضرورت مندوں کو دینا ماعون تصور کرتے تھے۔''

یعنی ایسی اشیائے استعمال سے بھی دوسروں کو فائدہ اٹھانے دینا شرعاً لازمی تصور کرتے تھے اور ان کا منع کرنا اس قرآنی حکم ﴿وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ﴾ [الماعون، ۱۰۷:۷] کے تحت ناجائز اور دین کی تکذیب تصور کرتے تھے۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے ملکیت کا جو تصور اپنے مبارک عمل سے واضح فرمایا اسے درج ذیل ارشادات سے سمجھا جا سکتا ہے:

۷۔ لو كان لي مثل أحد ذهباً لسرّني أن لا تمر عليّ ثلاث ليال وعندي

(۱) بخاري، الصحيح، كتاب الأطعمة، باب المؤمن يأكل في معي واحد، ۵: ۲۰۶۱، رقم: ۵۰۷۸

(۲) ۱۔ أبو داود، السنن، كتاب الزكاة، باب في حقوق المال، ۲: ۱۲۴، رقم: ۱۶۵۷

۲۔ نسائي، السنن الكبرى، ۶: ۵۲۲، رقم: ۱۱۷۰۱

منه شيء إلا شيئًا أرصده لدين.(۱)

''اگر میرے پاس احد (پہاڑ) کی مثل بھی سونا ہو تو مجھے تب خوشی ہوگی کہ اس پر تین راتیں نہ گزر جائیں (اور میں نے ان کو صدقہ نہ کیا ہو) اور میرے پاس سوائے اس شے کے جو میں نے دین ادا کرنے کے لئے رکھی ہے کچھ نہ ہو۔''

۸۔ فلما فتح الله عليه الفتوح قال: أنا أولى بالمؤمنين من أنفسهم فمن توفي من المؤمنين فترك دينًا فعليّ قضاؤه ومن ترك مالاً فلورثته.(۲)

''جب اللہ نے حضور نبی اکرم ﷺ کو فتوحات عطا فرمائیں تو آپ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ میں مؤمنین کا متولی ہوں جو ان میں سے فوت ہو جائے اور قرض چھوڑ جائے تو اس کی ادائیگی میرے ذمے ہے اور اگر مال چھوڑ گیا تو

(۱) ۱۔ بخاري، الصحيح، كتاب الرقاق، باب قول النبي ﷺ ما يسرني أن عندي مثل أحد هذا ذهبًا، ۵: ۲۳۶۸، رقم: ۶۰۸۰

۲۔ مسلم، الصحيح، كتاب الزكاة، باب تغليظ عقوبة من لا يؤدي الزكاة، ۲: ۶۸۷، رقم: ۹۹۱

۳۔ ابن حبان، الصحيح، ۱۴: ۲۶۰، رقم: ۶۳۵۰

۴۔ بيهقي، السنن الكبرى، ۵: ۳۵۴، رقم: ۱۰۷۳۸

(۲) ۱۔ بخاري، الصحيح، كتاب الكفالة، باب الدين، ۲: ۸۰۵، رقم: ۲۱۷۶

۲۔ مسلم، الصحيح، كتاب الفرائض، باب من ترك مالاً فلورثته، ۳: ۱۲۳۷، رقم: ۱۶۱۹

۳۔ ترمذي، السنن، كتاب الجنائز، باب ما جاء في الصلاة على الماوردي، ۳: ۳۸۲، رقم: ۱۰۷۰

۴۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲: ۴۵۳، رقم: ۹۸۴۷

۵۔ بيهقي، السنن الكبرى، ۷: ۵۳، رقم: ۱۳۱۲۳

وہ اس کے ورثاء کا ہوگا۔‘‘

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے ایسے تمام احکام کی عملی اہمیت کم کرنے کے لئے انہیں محض نفلی اور اضافی نیکی یعنی مستحبات میں شمار کر لیا ہے حالانکہ حضور نبی اکرم ﷺ کے قول و عمل سے ان کا وجوب اور لزوم ہی ثابت ہوتا ہے۔

۹۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

إن الله فرض على الأغنياء المسلمين في أموالهم بقدر الذي ما يسع فقراءهم. (۱)

’’اللہ تعالیٰ نے اغنیاء کے مال سے اس قدر (صدقہ) فرض فرمایا ہے جس سے فقراء کا فقر ختم ہو جائے۔‘‘

۱۱۔ زائد از ضرورت مال کی شرعی حیثیت

اموال پر قابض و متصرف ہونے کی بنا پر مالک کا حق دوسروں کے نفع اٹھانے کے حق پر مقدم ہوتا ہے یعنی پہلے مالک کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے اموال سے اپنی ضروریات پوری کرے اور بعد میں زائد از ضرورت مال (Surplus Property) میں سے دوسروں کی ضروریات پوری کرنے پر خرچ کرے۔

یہ تصور ان احکام پر مبنی ہے:

۱۔ ارشادِ ربّانی ہے:

يَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ط قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ

(۱) ۱۔ سعيد بن منصور، السنن، ۵: ۱۰۹، رقم: ۳۵۷۸
۲۔ هيثمي، مجمع الزوائد، ۳: ۶۲، رقم: ۴۳۲۴
۳۔ ابن حزم، المحلى، ۶: ۱۵۸

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌo[۱]

''آپ سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کیا خرچ کریں، فرما دیں جس قدر بھی مال خرچ کرو (درست ہے)، مگر اس کے حقدار تمہارے ماں باپ ہیں اور قریبی رشتہ دار ہیں اور یتیم ہیں اور محتاج ہیں اور مسافر ہیں، اور جو نیکی بھی تم کرتے ہو بیشک اللہ اسے خوب جاننے والا ہےo''

۲۔ حدیثِ نبوی ﷺ ہے:

یا ابن آدم إنک أن تبذل الفضل خیر لک وأن تمسکه شر لک ولا تلام علی کفاف وابدأ بمن تعول.[۲]

''اے اولادِ آدم! ضرورت سے زائد تمہارا مال کو خرچ کرنا بہتر ہے اور روک کر رکھنا تمہارے لئے شر ہے ہاں اس قدر بچانا قابل ملامت نہیں جو تیری ضرورت کے لئے کافی ہو اور انفاق کا آغاز ان سے کر جن کی ذمہ داری تجھ پر عائد ہوتی ہے۔''

اس حدیث کی رو سے صرف اسی قدر مال بچا کر رکھنے پر ملامت نہیں ہے جو ضروریات کے لئے کافی ہو۔ اس سے زائد رکھنا بہتر ہے اور اس میں سے دوسروں پر خرچ کرنا لازم ہے۔

(۱) البقرة، ۲: ۲۱۵

(۲) ۱۔ مسلم، الصحیح، کتاب الزکاة، باب بیان أن الید العلیا خیر من الید السفلی، ۲: ۷۱۸، رقم: ۱۰۳۶

۲۔ ترمذي، السنن، کتاب الزهد، باب ۳۲، ۴: ۵۷۳، رقم: ۲۳۴۳

۳۔ بیهقي، السنن الکبری، ۴: ۱۸۲، رقم: ۷۵۷۰

منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش www.MinhajBooks.com

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۱۴۔۱۱۷۶ھ) بھی اس تصور کی تائید ان الفاظ میں کرتے ہیں:

معنى الملك في حق الآدمي كونه أحق بالانتفاع من غيره.(۱)

''زمین پر آدمی کے حقِ ملکیت کا مطلب صرف یہ ہے کہ انتفاع کا حق، قابض کو دوسرے کی نسبت زیادہ ہے۔''

۱۲۔ حقِ تملّک اور حقِ انتفاع میں فرق

اسلام کے تصورِ ملکیت میں اموال پر قبضہ و تصرف (Proprietary Rights) کسی حد تک تو خالصتاً انفرادی حق تسلیم کیا گیا ہے کوئی اس میں کسی کو شریک کرے یا نہ کرے شریعت اس سے تعرض نہیں کرتی۔ مگر انتفاع یعنی اموال کی نفع بخشی اور سود مندی (Usufructuary Rights) میں محض انفرادی اور نجی حق شریعت کی رو سے کلیتًا غیر اسلامی ہے اس میں ہر شخص دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کا پابند ہے۔ زکوٰۃ، صدقات اور انفاق کے تمام احکام اس دعوے کے بیّن دلائل ہیں اگر اشیاء اموال کی مادی حیثیت ''Corpus'' کی ملکیت یعنی ان کے قبضہ و تصرف کی مانند ان کے منافع اور فوائد (Usufructs) کی ملکیت کو بھی مطلقاً نجی اور انفرادی ضرورت تک مختص رکھنے کی اجازت ہوتی تو شریعت لوگوں کے کمائے ہوئے مال و دولت پر زکوٰۃ، صدقات اور انفاق کے وجوبی اور لازمی احکام صادر نہ کرتی۔ یہ احکام مال کے قبضہ و تصرف میں شرکت کا مطالبہ نہیں کرتے بلکہ صرف ان کے حقِ انتفاع میں دوسروں کی شرکت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شریعتِ اسلامیہ میں مال (Property) کے قبضہ و تصرف کی حیثیت اس کے انتفاع کی حیثیت سے مختلف ہے۔ انتفاع میں اجتماعی حق جبکہ قبضہ اور تصرف میں بالعموم انفرادی حق زیادہ اہمیت کے ساتھ ملحوظ رکھا جاتا ہے اس تصور کی

(۱) شاه ولي الله، حجة الله البالغة، ۲: ۱۰۳

تائید ان قرآنی آیات سے ہوتی ہے:

۱۔ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ط نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًاo وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًاo[1]

’’مردوں کے لئے اس (مال) میں سے حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لئے (بھی) ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں کے ترکہ میں سے حصہ ہے۔ وہ ترکہ تھوڑا ہو یا زیادہ (اللہ کا) مقرر کردہ حصہ ہےo اور اگر تقسیمِ (وراثت) کے موقع پر (غیر وارث) رشتہ دار اور یتیم اور محتاج موجود ہوں تو اس میں سے کچھ انہیں بھی دے دو اور ان سے نیک بات کہوo‘‘

۲۔ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ج وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَ فِى الرِّقَابِ ج وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ج وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ج وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ط اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَo[2]

’’نیکی صرف یہی نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو بلکہ اصل نیکی تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور (اللہ

(۱) النساء، ۴: ۷، ۸

(۲) البقرۃ، ۲: ۱۷۷

کی) کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائے، اور اللہ کی محبت میں (اپنا) مال قرابت داروں پر اور یتیموں پر اور محتاجوں پر اور مسافروں پر اور مانگنے والوں پر اور (غلاموں کی) گردنوں (کو آزاد کرانے) میں خرچ کرے، اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور جب کوئی وعدہ کریں تو اپنا وعدہ پورا کرنے والے ہوں، اور سختی (تنگدستی) میں اور مصیبت (بیماری) میں اور جنگ کی شدّت (جہاد) کے وقت صبر کرنے والے ہوں، یہی لوگ سچے ہیں اور یہی پرہیز گار ہیں○"

۳۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ط وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللهَ بِهٖ عَلِیْمٌ○(۱)

"تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکو گے جب تک تم (اللہ کی راہ میں) اپنی محبوب چیزوں میں سے خرچ نہ کرو، اور تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو بیشک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے○"

۴۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّیْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَیْهِمْ ط اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّهُمْ ط وَ اللهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ○ اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللهَ هُوَ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ یَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَ اَنَّ اللهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ○(۲)

"آپ ان کے اموال میں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کیجئے کہ آپ اس (صدقہ) کے باعث انہیں (گناہوں سے) پاک فرمادیں اور انہیں (ایمان و مال کی پاکیزگی سے) برکت بخش دیں اور ان کے حق میں دعا فرمائیں، بیشک آپ کی دعا ان کے لئے (باعثِ) تسکین ہے، اور اللہ خوب سننے والا خوب

(۱) آل عمران، ۳: ۹۲

(۲) التوبۃ، ۹: ۱۰۳، ۱۰۴

جاننے والا ہے ○ کیا وہ نہیں جانتے کہ بیشک اللہ ہی تو اپنے بندوں سے (ان کی) توبہ قبول فرماتا ہے اور صدقات (یعنی زکوٰۃ و خیرات اپنے دستِ قدرت سے) وصول فرماتا ہے اور یہ کہ اللہ ہی بڑا توبہ قبول فرمانے والا نہایت مہربان ہے ○"

۵۔ اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ○(۱)

"جو غیب پر ایمان لاتے اور نماز کو (تمام حقوق کے ساتھ) قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا کیا ہے اس میں سے (ہماری راہ) میں خرچ کرتے ہیں ○"

۶۔ وَ سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ○ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ○(۲)

"اور اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف تیزی سے بڑھو جس کی وسعت میں سب آسمان اور زمین آجاتے ہیں، جو پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی ہے ○ یہ وہ لوگ ہیں جو فراخی اور تنگی (دونوں حالتوں) میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے (ان کی غلطیوں پر) درگزر کرنے والے ہیں، اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے ○"

۷۔ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ○ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ○ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ○ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ○ وَتَاْكُلُوْنَ

(۱) البقرۃ، ۲: ۳

(۲) آل عمران، ۳: ۱۳۳، ۱۳۴

التُّرَاثَ اَكْلاً لَّمًّاo وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّاo كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّاo وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّاo وَجِایْٓءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰىo[1]

’’مگر انسان (ایسا ہے) کہ جب اس کا رب اسے (راحت و آسائش دے کر) آزماتا ہے اور اسے عزت سے نوازتا ہے اور اسے نعمتیں بخشتا ہے تو وہ کہتا ہے: میرے رب نے مجھ پر کرم فرمایاo لیکن جب وہ اسے (تکلیف و مصیبت دے کر) آزماتا ہے اور اس پر اس کا رزق تنگ کرتا ہے تو وہ کہتا ہے: میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیاo یہ بات نہیں بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ عزت اور مال و دولت کے ملنے پر) تم یتیموں کی قدر و اِکرام نہیں کرتےo اور نہ ہی تم مسکینوں (یعنی غریبوں اور محتاجوں) کو کھانا کھلانے کی (معاشرے میں) ایک دوسرے کو ترغیب دیتے ہوo اور وراثت کا سارا مال سمیٹ کر (خود ہی) کھا جاتے ہو (اس میں سے افلاس زدہ لوگوں کا حق نہیں نکالتے)o اور تم مال و دولت سے حد درجہ محبت رکھتے ہوo یقیناً جب زمین پاش پاش کر کے ریزہ ریزہ کر دی جائے گیo اور آپ کا رب جلوہ فرما ہو گا اور فرشتے قطار در قطار (اس کے حضور) حاضر ہوں گےo اور اس دن دوزخ پیش کی جائے گی، اس دن انسان کو سمجھ آجائے گی مگر (اب) اسے نصیحت کہاں (فائدہ مند) ہو گیo‘‘

۸۔ يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًاo اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌo اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ o وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ o وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ o فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَo[2]

’’وہ (بڑے فخر سے) کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال خرچ کیا ہےo کیا وہ

(۱) الفجر، ۸۹: ۱۵۔ ۲۳

(۲) البلد، ۹۰: ۶۔ ۱۱

یہ خیال کرتا ہے کہ اسے (یہ فضول خرچیاں کرتے ہوئے) کسی نے نہیں دیکھا○ کیا ہم نے اس کے لئے دو آنکھیں نہیں بنائیں؟○ اور (اسے) ایک زبان اور دو ہونٹ (نہیں دیئے)؟○ اور ہم نے اسے (خیر و شر کے) دو نمایاں راستے (بھی) دکھا دیئے ○ وہ تو (دینِ حق اور عملِ خیر کی) دشوار گزار گھاٹی میں داخل ہی نہیں ہوا○"

۹۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ○(۱)

"اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تم اس میں سے (راہِ خدا میں) خرچ کرو جو تمہیں اللہ نے عطا کیا ہے تو کافر لوگ ایمان والوں سے کہتے ہیں کیا ہم اس (غریب) شخص کو کھلائیں جسے اگر اللہ چاہتا تو (خود ہی) کھلا دیتا۔ تم تو کھلی گمراہی میں ہی (مبتلا) ہو گئے ہو○"

۱۰۔ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ط فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ○(۲)

"اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) پر ایمان لاؤ اور اس (مال و دولت) میں سے خرچ کرو جس میں اس نے تمہیں اپنا نائب (وامین) بنایا ہے، پس تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے خرچ کیا اُن کے لئے بہت بڑا اَجر ہے○"

۱۱۔ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا

(۱) یٰسٓ، ۳۶: ۴۷

(۲) الحدید، ۵۷: ۷

يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَاo الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰـهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ط وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًاo وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ط وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًاo وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًاo(۱)

’’اور تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں (سے) اور نزدیکی ہمسائے اور اجنبی پڑوسی اور ہم مجلس اور مسافر (سے)، اور جن کے تم مالک ہو چکے ہو، (ان سے نیکی کیا کرو)، بیشک اللہ اس شخص کو پسند نہیں کرتا جو تکبّر کرنے والا (مغرور) فخر کرنے والا (خود بین) ہوo جو لوگ (خود بھی) بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو (بھی) بخل کا حکم دیتے ہیں اور اس (نعمت) کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا کی ہے، اور ہم نے کافروں کے لئے ذلت انگیز عذاب تیار کر رکھا ہےo اور جو لوگ اپنے مال لوگوں کے دکھاوے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یومِ آخرت پر، اور شیطان جس کا بھی ساتھی ہو گیا تو وہ برا ساتھی ہےo اور ان کا کیا نقصان تھا اگر وہ اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان لے آتے اور جو کچھ اللہ نے انہیں دیا تھا اس میں سے (اسکی راہ میں) خرچ کرتے اور اللہ ان (کے حال) سے خوب واقف ہےo‘‘

۱۲۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا

(۱) النساء، ۴: ۳۶۔۳۹

بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ط وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ○(۱)

’’اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تمہیں عطا کیا ہے اس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو قبل اس کے کہ وہ دن آ جائے جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہو گی اور (کافروں کے لئے) نہ کوئی دوستی (کارآمد) ہو گی اور نہ (کوئی) سفارش، اور یہ کفار ہی ظالم ہیں○‘‘

۱۳۔ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ○ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّ يَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ط عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ط وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ○ وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ط اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ط سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ط اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ○(۲)

’’(یہ) دیہاتی لوگ سخت کافر اور سخت منافق ہیں اور (اپنے کفر و نفاق کی شدت کے باعث) اسی قابل ہیں کہ وہ ان حدود و احکام سے جاہل رہیں جو اللہ نے اپنے رسول (ﷺ) پر نازل فرمائے ہیں اور اللہ خوب جاننے والا، بڑی حکمت والا ہے○ اور ان دیہاتی گنواروں میں سے وہ شخص (بھی) ہے جو اس (مال) کو تاوان قرار دیتا ہے جسے وہ (راہِ خدا میں) خرچ کرتا ہے اور تم پر زمانہ کی گردشوں (یعنی مصائب و آلام) کا انتظار کرتا رہتا ہے، (بلا و مصیبت کی) بری گردش انہی پر ہے، اور اللہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے○ اور بادیہ نشینوں میں (ہی) وہ شخص (بھی) ہے جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا

(۱) البقرة، ۲: ۲۵۴

(۲) التوبة، ۹: ۹۷۔ ۹۹

ہے اور جو کچھ (راہ خدا میں) خرچ کرتا ہے اسے اللہ کے حضور تقرب اور رسول (ﷺ) کی (رحمت بھری) دعائیں لینے کا ذریعہ سمجھتا ہے، سن لو، بیشک وہ ان کے لئے باعث قربِ الٰہی ہے، جلد ہی اللہ انہیں اپنی رحمت میں داخل فرما دے گا۔ بیشک اللہ بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے○"

۱۴۔ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ○(۱)

"اور نہ یہ کہ وہ (مجاہدین) تھوڑا خرچہ کرتے ہیں اور نہ بڑا اور نہ (ہی) کسی میدان کو (راہِ خدا میں) طے کرتے ہیں مگر ان کے لئے (یہ سب صرف وسفر) لکھ دیا جاتا ہے تاکہ اللہ انہیں (ہر اس عمل کی) بہتر جزا دے جو وہ کیا کرتے تھے○"

۱۵۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ط وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ○(۲)

"اے ایمان والو! ان پاکیزہ کمائیوں میں سے اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا ہے (اللہ کی راہ میں) خرچ کیا کرو اور اس میں سے گندے مال کو (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے کا ارادہ مت کرو کہ (اگر وہی تمہیں دیا جائے تو) تم خود اسے ہرگز نہ لو سوائے اس کے کہ تم اس میں چشم پوشی کر لو، اور جان لو کہ بیشک اللہ بے نیاز لائقِ ہر حمد ہے○"

۱۶۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰكُمْ

(۱) التوبۃ، ۹: ۱۲۱
(۲) البقرۃ، ۲: ۲۶۷

صَدَقَةً ذٰلِکَ خَيْرٌ لَّکُمْ وَ اَطْهَرُ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ○(۱)

اے ایمان والو! جب تم رسول (ﷺ) سے کوئی راز کی بات تنہائی میں عرض کرنا چاہو تو اپنی رازدارانہ بات کہنے سے پہلے کچھ صدقہ وخیرات کرلیا کرو، یہ (عمل) تمہارے لئے بہتر اور پاکیزہ تر ہے، پھر اگر (خیرات کے لئے) کچھ نہ پاؤ تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے○"

۱۷۔ وَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ○(۲)

"اور اُن کے اموال میں سائل اور محروم (سب حاجتمندوں) کا حق مقرر تھا○"

۱۸۔ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ○ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ○(۳)

"اور وہ (ایثار کیش) لوگ جن کے اَموال میں حصہ مقرر ہے○ مانگنے والے اور نہ مانگنے والے محتاج کا○"

۱۹۔ فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْکِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ط ذٰلِکَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللهِ وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ○(۴)

"پس آپ قرابت دار کو اس کا حق ادا کرتے رہیں اور محتاج اور مسافر کو (ان کا حق)، یہ ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو اللہ کی رضا مندی کے طالب ہیں، اور وہی لوگ مراد پانے والے ہیں○"

(۱) المجادلة، ۵۸: ۱۲
(۲) الذاريات، ۵۱: ۱۹
(۳) المعارج، ۷۰: ۲۴، ۲۵
(۴) الروم، ۳۰: ۳۸

۲۰۔ وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًاo(۱)

’’اور قرابتداروں کو انکا حق ادا کرو اور محتاجوں اور مسافروں کو بھی (دو) اور (اپنا مال) فضول خرچی سے مت اڑاؤo‘‘

۱۳۔ ارتکازِ دولت کی حیثیت

اگر کوئی شخص اپنے مملوکہ اموال کی آمدنی اور منافع اس خیال سے کہ یہ میری ذاتی ملکیت ہے صرف اپنی ضروریات اور آسائشوں تک رکھے اور ان سے دوسروں کو فائدہ نہ اٹھانے دے یعنی دوسرے مستحقین کے شرعاً تسلیم شدہ حقوق پورے نہ کرے تو اسے دولت کا جمع کرنا یا ارتکاز و اکتناز کہا جائے گا اور یہ امر شریعت میں حرام بلکہ باعثِ عذابِ جہنم ہے باوجود اس کے کہ اس نے وہ ساری دولت اپنے جائز ملکیتی ذرائع سے کمائی ہے۔

۱۔ ارشادِ ربّانی ہے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍo يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَo(۲)

’’اور جو لوگ سونا اور چاندی کا ذخیرہ کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو انہیں دردناک عذاب کی خبر سنا دیںo جس دن اس (سونے، چاندی اور مال) پر دوزخ کی آگ میں تاپ دی جائے گی پھر اس (تپے ہوئے مال) سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی، (اور ان سے کہا جائے گا) کہ یہ وہی (مال) ہے جو تم نے اپنی

(۱) بنی اسرائیل، ۱۷: ۲۶

(۲) التوبۃ، ۹: ۳۴، ۳۵

جانوں (کے مفاد) کے لئے جمع کیا تھا سو تم (اس مال کا) مزہ چکھو جسے تم جمع کرتے رہے تھےo‘‘

۲۔ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ. (۱)

’’تاکہ (سارا مال صرف) تمہارے مال داروں کے درمیان ہی نہ گردش کرتا رہے (بلکہ معاشرے کے تمام طبقات میں گردش کرے)۔‘‘

۳۔ اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗo يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗo كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِo وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُo نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُo الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِo اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌo فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍo (۲)

’’(خرابی و تباہی ہے اس شخص کے لئے) جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھتا ہےo وہ یہ گمان کرتا ہے کہ اس کی دولت اسے ہمیشہ زندہ رکھے گیo ہرگز نہیں! وہ ضرور حطمه (یعنی چورا چورا کر دینے والی آگ) میں پھینک دیا جائے گاo اور آپ کیا سمجھے ہیں کہ حطمه (چورا چورا کر دینے والی آگ) کیا ہے؟o (یہ) اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہےo جو دلوں پر (اپنی اذیت کے ساتھ) چڑھ جائے گیo بیشک وہ (آگ) ان لوگوں پر ہر طرف سے بند کر دی جائے گیo (بھڑکتے شعلوں کے) لمبے لمبے ستونوں میں (اور ان لوگوں کے لئے کوئی راہِ فرار نہ رہے گی)o‘‘

بنا بریں احتکار کو باعثِ عذاب اور محتکر کو ملعون قرار دیا گیا ہے۔

الغرض اسلام کا تصورِ ملکیت اپنے معنی و مفہوم اور روح کے اعتبار سے انفرادی حیثیت کا حامل ہے اور اسلام کے معاشی نظام کی وہ خشتِ اوّل ہے جو اس کی پوری

(۱) الحشر، ۵۹: ۷

(۲) الهمزة، ۱۰۴: ۲۔ ۹

ساخت وتشکیل کو دنیا کے دیگر معاشی نظامات سے ممتاز وممیّز کرتی ہے اور انسانیت کی فلاح و بہبود کی ضمانت فراہم کرنے میں تیقن کے ساتھ سرفہرست ہے۔

تحدیدِ ملکیت (Limitation of Ownership)

اسلام انفرادی اور اجتماعی حقِ ملکیت کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس میں نظم و ضبط اور اس کے غلط استعمال کو روکنے کی غرض سے چند حدود و قیود لگاتا ہے۔ خصوصی طور پر اگر کسی معاشرے میں معاشی ناہمواری اس حد تک بڑھ جائے کہ غرباء کا استحصال شروع ہو جائے اور اس حد تک پہنچ جائے کہ ان کے لیے زندگی گزارنا دوبھر ہو جائے تو اسلامک اسٹیٹ کے صاحبانِ اقتدار کو حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اسلامی اصولوں پر عمل کرتے ہوئے تحدیدِ ملکیت کریں۔ اسلامی حکومت اصحابِ ثروت کو اس امر پر مجبور کر سکتی ہے کہ وہ شریعت کے عائد کردہ حقوق ادا نہ کرنے کی صورت میں مقررہ حد سے زیادہ ملکیت نہ رکھیں اور اسلامی اسٹیٹ کا فرض ہے کہ وہ حالات و واقعات کے تناظر میں ملکیت کی حدود مقرر کرے اس حقیقت کا ثبوت ہمیں درج ذیل احادیثِ نبوی ﷺ سے بھی ملتا ہے:

۱۔ **من كان معه فضل ظهر فليعد به على من لا ظهر له ومن كان عنده فضل زاد فليعد به على من لا زاد له قال: فذكر أصناف المال ما ذكر حتى رأينا أنه لا حق لأحد منا في فضل.** (۱)

’’جس کے پاس زائد سواری ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسے اس شخص

(۱) ۱۔ مسلم، الصحيح، كتاب اللقطة، باب استحباب المؤاساة بفضول المال، ۳: ۱۳۵۴، رقم: ۱۷۲۸

۲۔ أبو داود، السنن، كتاب الزكاة، باب في حقوق المال، ۲: ۱۲۵، رقم: ۱۶۶۳

۳۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۳: ۳۴، رقم: ۱۱۳۱۱

۴۔ بيهقي، السنن الكبرى، ۴: ۱۸۲، رقم: ۷۵۷۱

کو لوٹا دے جس کے پاس سواری نہیں ہے اور جس کے پاس زائد ساز و سامان ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسے اس شخص کو لوٹا دے جس کے پاس سامان نہیں ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے مختلف اصناف کا ذکر فرمایا حتی کہ ہم سمجھے کہ ہم میں سے کسی کو بھی ضرورت سے زائد اشیاء اپنے پاس رکھنے کا کوئی حق نہیں۔‘‘

۲۔ دوسری روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا:

لا تمنعوا فضل الماء لتمنعوا به فضل الكلأ. (۱)

’’فالتو پانی مت روکو اس غرض سے کہ فالتو گھاس روک سکو۔‘‘

عصرِ حاضر میں کئی مواقع پر بعض حضرات نے حکومت کی طرف سے تحدیدِ ملکیت کرنے پر اعتراضات کیے ہیں اپنے مؤقف کے حق میں انہوں نے کچھ آیاتِ قرآنی کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ ان آیات کے باب میں ان کی پیش کردہ توضیح اور استدلال مغالطوں پر مبنی ہے۔ ذیل میں ہم ان کا جائزہ پیش کرتے ہیں:

تحدیدِ ملکیت کے منافی نقطہ نظر رکھنے والوں کے دلائل اور ان کا ردّ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام میں تحدیدِ ملکیت کا کوئی تصور نہیں۔ اپنے اس مؤقف کو ثابت کرنے کے لیے وہ جو دلائل پیش کرتے ہیں ذیل میں ہم ان کا تجزیہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی ان کا رد بھی پیش کرتے ہیں تاکہ حقیقت آشکار ہو سکے اور عامۃ الناس کو

(۱) ۱۔ بخاري، الصحيح، كتاب المساقاة، باب من قال إن صاحب الماء أحق بالماء، ۲: ۸۳۰، رقم: ۲۲۲۶

۲۔ مسلم، الصحيح، كتاب المساقاة، باب تحريم فضل بيع الماء الذي يكون بالفلاة ويحتاج إليه لراعي الكلأ وتحريم منع بذله وتحريم بيع ضراب الفحل، ۳: ۱۱۹۸، رقم: ۱۵۶۶

مسئلے کا صحیح ادراک حاصل ہو:

دلیل نمبر ا

ملکیت کی عدم تحدید کے ضمن میں وہ قرآن مجید کی درج ذیل آیت کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ یَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ط كُلٌّ فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ○(۱)

’’اور زمین میں کوئی چلنے پھرنے والا (جاندار) نہیں ہے مگر (یہ کہ) اس کا رزق اللہ (کے ذمۂ کرم) پر ہے اور وہ اس کے ٹھہرنے کی جگہ کو اور اس کے امانت رکھے جانے کی جگہ کو (بھی) جانتا ہے، ہر بات کتابِ روشن (لوحِ محفوظ) میں (درج) ہے○‘‘

استدلال

تحدیدِ ملکیت کے منافی نقطہ نظر رکھنے والے افراد اس آیت کریمہ سے اپنے مؤقف کا استدلال اس طرح کرتے ہیں: ’’چونکہ رزق کی فراہمی کا کام مذکورہ آیتِ کریمہ کے مطابق اللہ رب العزت نے اپنے ذمۂ کرم پر لے رکھا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کا کام ہے کہ وہ ہر ایک کو رزق فراہم کرے اور اسی کی مرضی اور اختیار ہے کہ وہ جسے چاہے اور جتنا چاہے رزق عطا فرمائے۔ اس کے دیئے ہوئے مال اور رزق میں کسی قسم کی حد قائم کرنا اس کے منشاء اور فیصلہ کے خلاف ہے۔ لہٰذا اس آیت مبارکہ کی رو سے تحدیدِ ملکیت جائز نہیں ہے۔‘‘

استدلال کا رد/جواب

مذکورہ بالا نظریہ کے حامل افراد کو یہ بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ اس آیتِ کریمہ

(۱) هود، ۱۱:۶

میں بنیادی بات جو بیان ہوئی ہے وہ ہے ''وعدۂ رزق''۔ بنیادی کام رزق فراہم کرنا ہے۔ گویا یہ آیت وعدۂ رزق کی فراہمی پر دلالت کرتی ہے۔ تحدیدِ ملکیت اس آیت کا موضوع ہی نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس آیت کا بنیادی موضوع رزق کی فراہمی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس وعدہ کی تکمیل اسلامی حکومت (Islamic State) سے کراتا ہے۔ گویا یہ ذمہ داری نیابتاً اسلامی حکومت پر عائد ہوتی ہے کہ وہ ہر کسی کو رزق فراہم کرنے کے مواقع پیدا کرے۔ اس منشائے الٰہی کی تکمیل کے لئے State اپنا کردار ادا کرنے کی مجاز ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جب رزق فراہم کرنے اور اس منشائے ایزدی کی تکمیل State کی ذمہ داری ہے تو اس تکمیل کیلئے حکومت کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ اگر ملک میں دولت کی تقسیم غیر متوازن ہو اور بعض کو بنیادی رزق بھی نہ مل رہا ہو اور بعض بے حد و حساب دولت کے مالک ہوں اور غیر متوازن تقسیم (Unbalanced Division) جب اس حد تک بڑھ گئی ہو کہ تقسیم کرنا اور تحدید کرنا ناگزیر اور ناروا ہو گیا ہو تو اس تقسیم میں توازن (Balance) پیدا کرنا حکومت (State) کی ذمہ داری اور اختیار ہے۔ اس ذمہ داری کے تحت اسے تحدید کرنے کا حق بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

دلیل نمبر ۲

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًاo وَ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ط وَ مَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ط اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ط قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًاo (۱)

''اور جو اللہ سے ڈرتا ہے وہ اس کے لئے (دنیا و آخرت کے رنج و غم سے) نکلنے کی راہ پیدا فرما دیتا ہےo اور اسے ایسی جگہ سے رِزق عطا فرماتا ہے جہاں

(۱) الطلاق، ۶۵: ۲، ۳

سے اس کا گمان بھی نہیں ہوتا، اور جو شخص اللہ پر توکل کرتا ہے تو وہ (اللہ) اسے کافی ہے، بیشک اللہ اپنا کام پورا کر لینے والا ہے، بیشک اللہ نے ہر شے کے لئے اندازہ مقرر فرما رکھا ہے ○"

استدلال

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ مطلقہ عورت کو ایسے ایسے طریقوں اور ایسی ایسی جگہوں سے رزق فراہم کرے گا جس کا وہ گمان بھی نہیں کر سکتی۔ گمان نہ کر سکنے کا مطلب ہے کہ اتنا زیادہ رزق عطا فرما دے گا کہ جس کا حساب ہی نہ کیا جا سکے۔ یوں بے گماں دینے کا مطلب ہے بے حساب دینا۔ اس لئے عورت کو چاہیے کہ وہ اللہ پر توکل کرے جو اللہ مطلقہ عورت کو بے حساب رزق دے سکتا ہے وہ تمام بنی نوع انسان کو بھی بے حدو حساب رزق فراہم کر سکتا ہے لہٰذا جس کو چاہے دے جس کو چاہے نہ دے۔ اور اس کے دیئے ہوئے پر حد قائم کرنا اس کے منشاء اور توکل کے خلاف ہے۔

رد/ جواب

اس آیت میں عورت کو طلاق کے وقت توکل علی اللہ کی تعلیم دی گئی ہے۔ چنانچہ آیت مبارکہ سے یہ استدلال کرنا کہ وہ کسی کو دے یا نہ دے یا کسی کو زیادہ دے اور کسی کو کم دے جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہی نہیں ہے اس لیے اس آیت سے یہ مفہوم نکالنا سراسر غلط ہے۔

مذکورہ آیت سے استدلال کرتے وقت بے گمان کو بے حساب کے معنی میں لینا بھی درست نہیں ہے۔ یہاں لفظ بے گمان کے ذریعہ توکل کرنے کی تعلیم دی گئی ہے نہ کہ بے حساب کے معنی و مفہوم مراد لئے گئے ہیں۔ اس طرح محولہ بالا آیت کا مفہوم تحدیدِ ملکیت کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، چنانچہ اس کو تحدیدِ ملکیت کی بحث میں بطور دلیل پیش کرنا ہی غلط ہے۔

دلیل نمبر۳

وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ط نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ. (۱)

''اور مفلسی کے باعث اپنی اولاد کو قتل مت کرو۔ ہم ہی تمہیں رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی (دیں گے)۔''

استدلال

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرما دیا ہے کہ ہم تمہیں رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی دیں گے۔ رزق دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ حکومت کا یا کسی دوسرے شخص کا کام نہیں ہے۔ چونکہ کام اللہ کا ہے اس لیے اس کی مرضی کسی کو کم دے یا زیادہ دے۔ اس میں شکوہ کرنے، تحدید کرنے یا اس میں مداخلت کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے۔

رد/ جواب

اللہ رب العزت نے جب فرما دیا کہ ہم رزق دیتے ہیں تمہیں بھی اور انہیں بھی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا منشاء یہ ہے کہ سب کو رزق ملے۔ اب اللہ کے اس منشاء ہی کی تکمیل کے لئے نظامِ ریاست میں حکومت (State) قائم ہوتی ہے۔ نظام الحقوق اور نظام الفرائض پر عمل درآمد کرانا حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اللہ کا حکم آ گیا کہ نماز پڑھو۔ اب نظامِ صلوٰۃ کی تنفیذ اسلامی State کی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح اللہ کا حکم آ گیا کہ سود حرام ہے۔ اب نظامِ معیشت میں سود کی حرمت کو Establish کرنا State کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔ اللہ کا حکم آ گیا کہ زنا حرام ہے اور اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والے کی سزا (حد) بھی مقرر کر دی گئی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سزا کون دے گا؟ اللہ نے خود آ کر تو یہ حد نہیں لگانی لہٰذا یہ حد لگانے کا فریضہ State

(۱) الانعام، ۶: ۱۵۱

سرانجام دے گی۔ ان مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ کی رضا مندی حکم بن جاتی ہے اور اس حکم کی تنفیذ State کی ذمہ داری (Responsibility) قرار پاتی ہے۔

اس وضاحت کے بعد آیت کا صحیح مفہوم کچھ یوں ہو گا کہ ہم نے یہ ذمہ داری لے لی ہے کہ تم سب کو اور ان کو بھی رزق بہم پہنچایا جائے۔ ہمارے اس منشاء کی تکمیل حکومت (State) کی ذمہ داری ہے۔ گویا سب کو رزق فراہم کرنا حکومت (State) ہی کی ذمہ داری ہے۔ اپنی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اس منشائے ایزدی کی تکمیل میں جو رکاوٹیں، مشکلات اور مسائل درپیش ہوں ان کو بھی دور کرے۔ ان رکاوٹوں میں سے ایک رکاوٹ دولت کی غیر متوازن تقسیم بھی ہے۔ اس تقسیم کو توازن میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ تحدیدِ ملکیت کے جائز اختیار کو استعمال کرے تاکہ ہر کسی کو رزق فراہم کرنے میں آسانی ہو۔

دلیل نمبر۴

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ○(۱)

’’اور کتنے ہی جانور ہیں جو اپنی روزی (اپنے ساتھ) نہیں اٹھائے پھرتے اللہ انہیں بھی رزق عطا کرتا ہے اور تمہیں بھی، اور وہ خوب سننے والا جاننے والا ہے○‘‘

استدلال

زمین پر بسنے والے تمام جانوروں کو اللہ تعالیٰ اس حالت میں بھی رزق فراہم کر دیتا ہے جب ان کے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہوتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ انسانوں کو بھی رزق

(۱) العنکبوت، ۲۹: ۶۰

فراہم کرتا ہے۔ اس آیت میں جانوروں کی مثال دے کر اللہ تعالیٰ نے یہ بات سمجھائی ہے کہ اللہ جس طرح جانوروں کو رزق دیتا ہے اسی طرح انسانوں کو بھی رزق دینے والا وہی ہے۔ اس کی مرضی ہے کہ جس کو چاہے زیادہ دے اور جس کو چاہے کم دے۔ اس طرح حدِ ملکیت کی نفی ہو جاتی ہے۔

رد/ جواب

مذکورہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے جانوروں کی مثال بیان فرمائی ہے کہ اللہ ان کو جس طرح رزق دیتا ہے تمہیں بھی فراہم کرے گا۔ اس مثال پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ رزق دینے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام جانوروں کے لیے رزق کے یکساں مواقع پیدا فرمائے ہیں مثلاً ایک جنگل میں اگر دو شیر ہیں تو دونوں کے لیے شکار بھی وہیں پیدا فرما دیا۔ اسی طرح تمام انسانوں کے لیے بھی رزق کے مواقع یکسر پیدا فرمائے لیکن اگر کسی وجہ سے ان مواقع میں توازن برقرار نہ رہا ہو تو ان میں توازن پیدا کرنے کے لئے حکومت (State) اپنا کردار ادا کرے گی جو تحدیدِ ملکیت کے قانون کے نفاذ/عمل کا آئینہ دار ہے۔

دلیل نمبر ۵

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○ (۱)

’’(اے حبیب! یوں) عرض کیجئے: اے اللہ! سلطنت کے مالک! تُو جسے چاہے

(۱) آل عمران، ۳: ۲۶، ۲۷

سلطنت عطا فرما دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے اور تُو جسے چاہے عزت عطا فرما دے اور جسے چاہے ذلّت دے، ساری بھلائی تیرے ہی دستِ قدرت میں ہے، بیشک تُو ہر چیز پر بڑی قدرت والا ہے ○ تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور تُو ہی زندہ کو مُردہ سے نکالتا ہے اور مُردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے (اپنی نوازشات سے) بہرہ اندوز کرتا ہے○"

استدلال

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بیان فرما دیا ہے کہ اللہ ہی مالک الملک ہے۔ تمام کائنات اور اس کے تمام ذرائع اور وسائل کا وہی مالک ہے اور جسے وہ چاہتا ہے یہ وسائل اور ذرائع عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔ یہ بھی واضح کر دیا کہ جسے چاہتا ہے رزق دیتا ہے اور یہ رزق بھی بے حساب ہوتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے رزق دینے میں حساب و کتاب کی تحدید نہیں رکھی تو تحدید کرنا اللہ کی مرضی اور قرآن مجید کی تعلیم کے خلاف ہے۔

رد/ جواب

مذکورہ آیت میں بغیر حساب کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی بھی حساب و کتاب نہ رکھے۔ اس طرح حکومت (State) کو بھی کوئی اختیار نہیں کہ وہ حساب و کتاب رکھنے کا انتظام وانصرام کرے۔ بغیر حساب کا یہ مفہوم بالکل غلط ہے۔ اگر یہ مفہوم لیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ محاصل (Taxes) کے سارے محکمے ختم کرنے ہوں گے اور اس کے ساتھ ساتھ Revenue کے سارے معاملات بھی ختم کرنے ہوں گے جو نظامِ حکومت چلانے میں اختلال کا باعث ہوں گے۔

اگر بغیر حساب کا مطلب یہ لیا جائے کہ حساب کتاب ہی نہ رکھا جائے تو خود

احکامِ خداوندی میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ اسلامی تعلیمات میں حساب کتاب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ نیکیوں اور برائیوں کا Record کراماً کاتبین کے ذریعے اعمالِ صالحہ اور اعمالِ سوء میں جزء و سزا کا حساب کتاب اور سب سے بڑھ کر یوم الحساب کا انعقاد حساب کتاب رکھنے کے دلائل ہیں۔ عملی زندگی میں مثال کے طور پر زکوٰۃ کو لیں تو اس کا تو سارے کا سارا نظامِ حساب و کتاب پر ہی مشتمل ہے اس طرح ان دلائل سے مختلف شعبوں میں تحدیدِ ملکیت کا عنصر ثابت ہوتا ہے۔

"بغیر حساب" کا ایک اور مطلب یہ ہے کہ اللہ بندے کے ساتھ کوئی حساب و کتاب کا معاملہ نہیں کرتا یا اللہ بندے کو جتنا بھی عطا کر دے اس کا بدلہ نہیں مانگتا۔ اللہ پر دینے میں کوئی قدغن نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ State کو کوئی حق ہی نہیں ہے کہ وہ حساب و کتاب رکھے۔ جب دینے میں کوئی قدغن نہیں تو مفہوم مخالف کی رو سے لینے پر بھی کوئی قدغن نہیں۔ اس میں Nationalization کا تصور ہے۔ یعنی جو دے سکتا ہے وہ Nationalize بھی کر سکتا ہے۔ آیتِ کریمہ کا پہلا حصہ بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے:

تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ. (۱)

"اللہ جسے چاہتا ہے ملک دے دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے واپس لے بھی لیتا ہے، جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے عزت چھین کر ذلت دے دیتا ہے۔"

آیت کے اس حصہ کی رو سے جب دے سکتا ہے تو واپس بھی لے سکتا ہے۔ یہی حال رزق اور مال و دولت کا ہے کہ جب اللہ دے سکتا ہے تو واپس بھی لے سکتا ہے۔ واپسی کا کام اللہ کے منشاء کی تکمیل کے لیے State کر سکتی ہے، اسی طرح اگر اللہ پر

(۱) آل عمران، ۳: ۲۶

دینے میں کوئی قدغن نہیں تو اسلامی اسٹیٹ پر اس کے منشاء کی تکمیل کے لئے واپس لینے میں بھی کوئی قدغن نہیں ہے۔ State کا مال واپس لینا تحدید ہی کی صورت ہے۔ اس طرح تحدیدِ ملکیت جائز ہے۔

دلیل نمبر ٦

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ ط اِنَّ رَبَّکَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ○(۱)

’’اور وہی ہے جس نے تم کو زمین میں نائب بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض پر درجات میں بلند کیا تاکہ وہ ان (چیزوں) میں تمہیں آزمائے جو اس نے تمہیں (امانتاً) عطا کر رکھی ہیں۔ بیشک آپ کا رب (عذاب کے حقداروں کو) جلد سزا دینے والا ہے اور بیشک وہ (مغفرت کے امیدواروں کو) بڑا بخشنے والا اور بے حد رحم فرمانے والا ہے○‘‘

استدلال

اس آیت میں ﴿وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ﴾ (اور تم میں سے بعض کو بعض پر درجات میں بلند کیا) کے الفاظ اس بات کو ثابت کر رہے ہیں کہ اللہ نے ہی مال و اختیارات میں بعض کو بعض پر فضیلت دی یعنی بعض کو بے حد وحساب رزق دیا اور بعض کو کم۔ یہ تقسیم مِنْ جَانِبِ اللہ ہے۔ اس لئے اس تقسیم میں ردو بدل کرنا کسی کے لئے جائز نہیں ہے۔ اس تقسیم میں اگر اس نے کسی کو بے حد وحساب رزق عطا کر دیا ہے تو State کو اس پر حد عائد کرنے کا کیا حق ہے؟ لہٰذا تحدیدِ ملکیت کی نفی اس آیتِ کریمہ سے بھی ثابت ہے۔

(۱) الانعام، ٦: ١٦٥

رد/ جواب

تحدیدِ ملکیت کے منافی نقطہ نظر رکھنے والے کا سوال ہے کہ State کو کیا حق ہے کہ اللہ کی تقسیم اور عطا میں حد مقرر کرے؟ اس کا جواب بھی اسی آیت میں موجود ہے۔ آیت میں موجود الفاظ ﴿لِيَبْلُوَكُمْ فِيمَا اٰتٰكُمْ﴾ (تاکہ جو کچھ تمہیں دیا اس میں تمہیں آزمائے) نے State کو یہ حق دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مال دے کر آزماتا ہے کہ جو مال اس بندے کو دیا گیا ہے کیا وہ اس مال کے حقوق ادا کر رہا ہے؟ اگر مال کے حقوق کی ادائیگی میں پورا نہیں اتر رہا تو State کی ذمہ داری ہے کہ وہ مال واپس لے لے۔ جب دولت کا صحیح مقصد پورا نہ ہو رہا ہو یا دوسروں کی حق تلفی ہو رہی ہو اور ضرر کا احتمال واضح ہو رہا ہو تو State کو اختیار ہے کہ وہ Limitations عائد کرے کیونکہ یہ حکم لِيَبْلُوَكُمْ فِيمَآ اٰتٰكُمْ کے تحت آتا ہے اور یہی تحدیدِ ملکیت ہے۔

دلیل نمبر ۷

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ.(۱)

’’اور اللہ نے تم میں سے بعض پر رزق (کے درجات) میں فضیلت دی ہے۔‘‘

استدلال

اس آیتِ کریمہ میں اللہ رب العزت نے واضح اعلان فرما دیا ہے کہ اس نے بعض لوگوں کو رزق کے معاملہ میں بعض پر فضیلت عطا کی ہے۔ اس فضیلت و افضلیت میں کسی دوسرے شخص یا State کو کوئی اختیار حاصل نہیں کہ وہ خدا کے دیئے ہوئے مال میں تحدید کا قانون لاگو کرے۔

(۱) النحل، ۱۶: ۷۱

رد/ جواب

مذکورہ بالا آیتِ مبارکہ کو تحدیدِ ملکیت کے منافی نظریہ میں بطور دلیل پیش کرنے والے اس آیت کو مکمل طور پر بیان نہیں کرتے۔ ذیل میں مکمل آیت اور اس کا ترجمہ ذکر کیا جاتا ہے تاکہ مسئلہ کا صحیح ادراک ممکن ہو سکے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ ج فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّىْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ط اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ○(۱)

’’اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق (کے درجات) میں فضیلت دی ہے (تاکہ وہ تمہیں حکمِ انفاق کے ذریعے آزمائے)، مگر جن لوگوں کو فضیلت دی گئی ہے وہ اپنی دولت (کے کچھ حصہ کو بھی) اپنے زیرِ دست لوگوں پر نہیں لوٹاتے (یعنی خرچ نہیں کرتے) حالانکہ وہ سب اس میں (بنیادی ضروریات کی حد تک) برابر ہیں، تو کیا وہ اللہ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں○‘‘

اس آیت میں واضح حکم ہے کہ صاحب ثروت لوگ اپنی دولت کو اپنے زیردست اور خستہ حال لوگوں کو لوٹا دیں۔ آیت میں ’’رآدّی (لوٹانا)‘‘ کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ مال غریبوں کا حق ہے اگر یہ لوگ ان کا حق اپنی مرضی سے نہیں دیتے تو حکومت (State) کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ان لوگوں سے غریبوں کا حق وصول کر کے ان تک پہنچائیں۔

www.MinhajBooks.com

دلیل نمبر ۸

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ط نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِى

(۱) النحل، ۱۶: ۷۱

الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ط وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ○ (۱)

’’کیا یہ لوگ آپ کے رب کی رحمتِ (خاصہ یعنی نبوت) کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ دنیاوی زندگی میں (تو) ان کو روزی ہم (ہی) نے تقسیم کر رکھی ہے اور ہم نے ایک کو دوسرے پر رفعت دے رکھی ہے تاکہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے (اور عالم کا انتظام قائم رہے) اور آپ کے رب کی رحمت بدرجہا اس (دنیوی مال و متاع) سے بہتر ہے جس کو یہ لوگ سمیٹتے پھرتے ہیں○‘‘

استدلال

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ رب العزت نے دنیاوی زندگی کا ایک ایسا نظام بیان فرمایا ہے جس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا۔ وہ نظام کچھ یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیاوی زندگی کو گزارنے کے لئے روزی اور رزق کو تمام لوگوں میں تقسیم فرمایا۔ اس تقسیم میں اس نے بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی۔ پھر فضیلت عطا کرنے کی وجہ ان الفاظ میں بیان فرمائی کہ امیر لوگ غریب لوگوں سے خدمت اور کام لیں۔ اس طرح یہ نظامِ زندگی چلتا رہے۔ اللہ تعالیٰ نے نظامِ زندگی کو قائم رکھنے کے لیے روزی کی تقسیم کو بھی اس طرح رکھا کہ بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ اب اگر تحدید کے نام پر اس تقسیم میں بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو نظامِ زندگی درہم برہم ہو جائے گا، لہٰذا نظامِ زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے تحدیدِ ملکیت ناجائز اور غلط ہے۔

www.MinhajBooks.com

ردّ / جواب

مذکورہ بالا نظریہ کے حامل افراد کو اس آیت کے صحیح مفہوم کو سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے۔ اس آیت کے جس لفظ کے ترجمہ میں مغالطہ ہوا ہے وہ ہے ’’سُخْرِيًّا‘‘ جس کا ترجمہ

(۱) الزخرف، ۴۳: ۳۲

انہوں نے ''خدمت لینا'' کیا ہے۔ ذیل میں ہم اس لفظ کے حقیقی معانی و مفاہیم بیان کرتے ہیں تاکہ اس کا مطلب واضح ہو جائے۔

لفظ سخریا اپنی بناوٹ کے لحاظ سے ''س۔ خ۔ ر'' سے مشتق ہے۔ ثلاثی مجرد میں باب سَمِعَ یَسْمَعُ سے سَخِرَ یَسْخَرُ استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ اپنی اسی بناوٹ سے سورۃ التوبہ کی درج ذیل آیت میں استعمال ہوا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ط سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ○(۱)

''جو لوگ برضا و رغبت خیرات دینے والے مؤمنوں پر (ان کے) صدقات میں (ریاکاری و مجبوری کا) الزام لگاتے ہیں اور ان (نادار مسلمانوں) پر بھی (عیب لگاتے ہیں) جو اپنی محنت و مشقت کے سوا (کچھ زیادہ مقدور) نہیں پاتے سو یہ (ان کے جذبۂ انفاق کا بھی) مذاق اڑاتے ہیں، اللہ انہیں ان کے تمسخر کی سزا دے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے○''

اس آیت میں 'یَسْخَرُوْنَ' مضارع اور ''سَخِرَ'' ماضی کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ سخر کا لغوی معنی ہے ''مذاق اڑانا، تمسخر کرنا'' وغیرہ۔ لسان العرب میں ہے:

وبه سَخْرًا وسَخَرًا وَمَسْخَرًا وسُخْرًا وسُخْرَةً وسِخَرِيًّا وسُخْرِيًّا وسُخْرِيَّةً: هزئ به.(۲)

''سخر سے ہی سَخْرًا، سَخَرًا، مَسْخَرًا، سُخْرًا، سُخْرَةً، سِخْرِيًّا، سُخْرِيًّا اور سُخْرِيَّةً (یہ تمام الفاظ) بنتے ہیں (جن کا مطلب ہے) مذاق اڑانا۔''

(۱) التوبة، ۹: ۷۹

(۲) ابن منظور إفريقي، لسان العرب، ۴: ۳۵۲

اس معنی میں یہ لفظ قرآن مجید کی درج ذیل آیات میں بھی استعمال ہوا ہے:

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ○(۱)

’’اور بیشک آپ سے پہلے (بھی) رسولوں کے ساتھ مذاق کیا جاتا رہا۔ پھر ان میں سے مسخرہ پن کرنے والوں کو (حق کے) اسی (عذاب) نے آگھیرا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے○‘‘

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ط سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ○(۲)

’’جو لوگ برضا و رغبت خیرات دینے والے مومنوں پر (ان کے) صدقات میں (ریاکاری و مجبوری کا) الزام لگاتے ہیں اور ان (نادار مسلمانوں) پر بھی (عیب لگاتے ہیں) جو اپنی محنت و مشقت کے سوا (کچھ زیادہ مقدور) نہیں پاتے سو یہ (ان کے جذبۂ انفاق کا بھی) مذاق اڑاتے ہیں، اللہ انہیں ان کے تمسخر کی سزا دے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے○‘‘

وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ ق وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ط قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ○(۳)

’’اور نوح (علیہ السلام) کشتی بناتے رہے اور جب بھی ان کی قوم کے سردار اُن کے پاس سے گزرتے ان کا مذاق اڑاتے۔ نوح (علیہ السلام) (انہیں جواباً) کہتے: اگر

(۱) الانعام، ۶: ۱۰

(۲) التوبۃ، ۹: ۷۹

(۳) ھود، ۱۱: ۳۸

(آج) تم ہم سے تمسخر کرتے ہوتو (کل) ہم بھی تم سے تمسخر کریں گے جیسے تم تمسخر کر رہے ہوo‘‘

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا. (۱)

’’کافروں کے لئے دنیا کی زندگی خوب آراستہ کر دی گئی ہے اور وہ ایمان والوں سے تمسخر کرتے ہیں۔‘‘

بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَo (۲)

’’بلکہ آپ تعجب فرماتے ہیں اور وہ مذاق اڑاتے ہیںo‘‘

اب ذیل میں سِخْرِیًّا کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں جس کا مطلب بھی تمسخر کرنا اور مذاق اڑانا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِىْ وَ كُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَo (۳)

’’تو تم ان کا تمسخر کیا کرتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے تمہیں میری یاد بھی بھلا دی اور تم (صرف) ان کی تضحیک ہی کرتے رہتے تھےo‘‘

اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُo (۴)

’’کیا ہم ان کا (ناحق) مذاق اڑاتے تھے یا ہماری آنکھیں انہیں (پہچاننے) سے چوک گئی تھیں (یہ عمّار، خباب، صُہیب، بلال اور سلمان ﷺ جیسے فقراء اور درویش تھے)o‘‘

(۱) البقرۃ، ۲: ۲۱۲
(۲) الصافات، ۳۷: ۱۲
(۳) المؤمنون، ۲۳: ۱۱۰
(۴) ص، ۳۸: ۶۳

ان آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے زیر بحث آیت کا اگر درج ذیل ترجمہ کیا جائے تو آیت کا مفہوم واضح ہونے کے ساتھ ساتھ زیرِ بحث مسئلہ کا صحیح حل پیش کرے گا۔ صحیح ترجمہ یہ ہوگا:

''کیا آپ کے رب کی رحمتِ (نبوّت) کو یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ ہم اِن کے درمیان دنیوی زندگی میں ان کے (اسبابِ) معیشت کو تقسیم کرتے ہیں اور ہم ہی ان میں سے بعض کو بعض پر (وسائل و دولت میں) درجات کی فوقیت دیتے ہیں (کیا ہم یہ اس لئے کرتے ہیں) کہ ان میں سے بعض (جو امیر ہیں) بعض (غریبوں) کا مذاق اڑائیں اور آپ کے رب کی رحمت اس (دولت) سے بہتر ہے جسے وہ جمع کرتے (اور گھمنڈ کرتے) ہیں۝''

اس ترجمہ کی رو سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ زیرِ بحث آیت کا مضمون تحدیدِ ملکیت کے منافی ہرگز نہیں ہے بلکہ تحدیدِ ملکیت کے حق میں ہے۔ اگر امراء اپنی دولت کے بل بوتے پر غریبوں کا مذاق اڑاتے ہیں تو اسلامی حکومت کو اختیار حاصل ہے کہ وہ ان سے ایسی دولت چھین لے جس پر وہ گھمنڈ کرتے ہیں او رغرباء کا مذاق اڑاتے ہیں۔

ایک اور تحقیق کے مطابق:

سخر سے باب تفضیل ''سَخَّرَ یُسَخِّرُ تَسْخِیْرًا'' بنتا ہے جس کا مطلب ہے ''مسخر کرنا، تسخیر کرنا''۔ یہ لفظ اپنے معنی میں جبری محنت کو سموئے ہوئے ہے۔ لسان العرب میں ہے:

سَخَّرَ یُسَخِّرُ سُخْرِیًّا: کلّفه ما لا یرید وقهره.(۱)

''سَخَّرَ یُسَخِّرُ سُخْرِیّاً کا مطلب ہے کسی کو ایسے کام کا مکلّف بنانا اور ایسے

(۱) ابن منظور افریقي، لسان العرب، ۴: ۳۵۳

کام پر مجبور کرنا جو وہ کرنا نہیں چاہتا۔‘‘

اس معنی کی رو سے زیرِ بحث آیت کا مضمون کچھ یوں بنے گا کہ ہم نے یہ تقسیم اس لیے کی کہ امیر غریبوں سے زبردستی خدمت (Forced Services) اور جبری محنت (Compelled Labour) لیں؟ ہمارا مقصد اس تقسیم کا یہ ہرگز نہیں تھا کہ غریبوں کا استحصال کیا جائے اور غربت کی وجہ سے ان کا مذاق اڑایا جائے۔ اگر امیر طبقہ غریبوں کا استحصال کرنے لگے تو حکومت کو چاہیے کہ وہ دخل اندازی کر کے غریب عوام کو ان کے حقوق دلوائے اور ان کی عزتِ نفس بحال کرے۔ اس مقصد کے لیے اس کو اگر تحدیدِ ملکیت کا اصول نافذ کرنا پڑے تو یہ قرینِ مصلحت اور جائز تصور ہو گا۔

بحث کا ماحاصل

مذکورہ بالا تمام آیات سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ اسلامی معاشی تعلیمات کے تحت ’’تحدیدِ ملکیت‘‘ جائز ہے اور اسلامی مملکت حالات و واقعات کے تناظر میں تحدیدِ ملکیت کرنے کی مجاز ہے۔

انسان اور کائنات

انسان آج بھی کتاب کائنات کے مطالعہ میں سرگرم ہے اور اپنی تحقیق و جستجو میں مشغول رہتا ہے۔ اب تک جو ترقی ہوئی وہ اس کائنات کی مخلوقات میں غور و فکر کرنے اور اس عالم طبیعت کے علل و معلولات پر آگاہ ہونے ہی کی مرہون منت ہے۔ آج اِنسان کی یہی کوشش ہے کہ حتی المقدور عالم طبیعت کے تاریک گوشوں کو اپنے علم و تحقیق کے نور سے روشن کرے اور کائنات کے نا معلوم اسرار و رموز کے چہرے سے نقاب اُلٹ دے۔ تاکہ اس ترقی و کمال کی راہ میں ایک قدم اور آگے بڑھائے اور نو بہ نو کامیابیاں اس کا مقدر بن جائیں۔ اب اگر کوئی سوال کرے کہ حق تعالیٰ کی طرف توجہ کئے بغیر کتاب خلقت کا مطالعہ کرنا اور حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اس کا مطالعہ کرنا۔ ان دونوں میں کیا فرق

ہے؟ بالفاظ دیگر عالم کائنات میں غور وفکر کرتے ہوئے اسرار گیتی کی واقفیت پانا تو بلندی اور ترقی کا موجب ہے، کیا ایمان باللہ کے ساتھ ترقی اور بغیر ایمان باللہ کے ترقی میں باہم فرق ہے؟ اگر فرق ہے تو یہ فرق فقط نفسیاتی پہلو رکھتا ہے یا عملاً انسانی زندگی پر اثر انداز بھی ہوتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خالق کی طرف توجہ کرتے ہوئے مخلوق کا مطالعہ اس عالم ہستی کے حکیمانہ نظام کی توجیہ میں علمی واقعیت پسندی ہے اور مخلوقات عالم کے خالق کا اعتراف کرتے ہوئے ان سے فائدہ اُٹھانا اس پیدا کرنے والے خالق کے حق میں انسانی اور اخلاقی حق پسندی ہے۔ لیکن ان دونوں معنوی پہلوؤں سے منہ پھیرنا ایک غیر اخلاقی حرکت ہے۔ ہم کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہوئے ترقی کرنا ایک صحیح اور بے عیب ترقی ہے اور انسانی زندگی پر دو طرح سے اثر انداز ہوتی ہے۔ ان دونوں جہتوں کا خلاصہ ہم ذیل میں بیان کئے دیتے ہیں۔

اول: ایک مسلمان انسان جو تمام ارضی و سماوی موجودات کو مخلوق و مملوک خدا مانتا ہے۔ وہ اپنے لئے لازم جانتا ہے کہ ہمیشہ اس ذات حق کی اطاعت کرے اور اپنے تمام معمولات زندگی میں بلاقید و شرط اس کا مطیع رہے۔ وہ اپنی حدود سے آگاہ ہوتا ہے اور اپنے خالق و مالک کی ملکیت میں اس کی دی ہوئی اجازت کے مطابق تصرف کرتا ہے۔ وہ اپنی خداداد طاقتوں کو لوگوں کی خدمت میں صرف کرتا ہے اور اپنی توانائیاں راہ ظلم و جرم میں خرچ نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ جائز اقتصادی ذریعہ اختیار کرتا ہے اور چوری یا دیگر بری حرکتوں سے پرہیز کرتا ہے۔ ایسا انسان کسی روز اپنی علمی تحقیق وتلاش کے ذریعے ایٹم کو مسخر کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اِسے بھی خداوند عالم کی دی ہوئی اجازت کے مطابق اِستعمال کرتا ہے۔ مثلاً بیماریوں کا علاج کرنے، شہروں میں روشنی مہیا کرنے، بحری جہازوں کو چلانے، ہوائی جہازوں کو اُڑانے، کرّوں کو متحرک رکھنے، غرض یہ کہ وہ اس قوت کو ایسے اُمور میں صرف کرتا ہے جن سے لوگوں کو رفاہ اور آسائش حاصل ہو۔ وہ ایٹمی توانائی کو خالق کی رضا کے خلاف آبادیوں کو تباہ کرنے، اجتماعی قتل و غارت بپا کرنے، بچوں،

بوڑھوں، مردوں، عورتوں، بیماروں، تندرستوں سب کو یکبارگی نابود کرنے میں ہرگز اِستعمال نہیں کرتا۔ غیر مسلم جارحیت پسند طبقہ جو کچھ بھی کرے گا وہ اِس کے برعکس کرے گا۔

اسلام کا تصوّرِ عبادت

عبادت کے لغوی معنی عابد کا اپنے معبود کے سامنے تضرع و تذلل کرتے ہوئے اس کی اطاعت کرنا ہے۔ قرآن حکیم نے سب انسانوں کو پروردگار عالم کی عبادت و بندگی کی دعوت دی اور ان پر فرض عائد کیا ہے کہ وہ اس مقدس عمل کو بجا لائیں۔ عجیب بات ہے کہ اِسلام کی اس آسمانی کتاب نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کو اس کے خالق ہونے سے مربوط کیا اور لوگوں کو عبادت خدا کی دعوت دیتے وقت اس عالم کائنات کی خلقت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ درحقیقت وہ اس یاد دہانی میں اللہ کی عبادت کے علل و اسباب کی توجیہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

قَالُوْا سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ط اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ ○ (۱)

”فرشتوں نے عرض کیا: تیری ذات (ہر نقص سے) پاک ہے ہمیں کچھ علم نہیں مگر اسی قدر جو تو نے ہمیں سکھایا ہے، بیشک تو ہی (سب کچھ) جاننے والا حکمت والا ہے○“

یہ ایک حقیقت ہے کہ اِنسان جتنی بھی ترقی کر لے نظامِ کائنات کی تہہ در تہہ حکمتوں کو کاملاً نہیں سمجھ سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی بندگی اختیار کرنے کا حکم فرمایا ہے اور واضح بتایا ہے کہ انسان کی تخلیق ہی بندگی کے لئے کی گئی ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ○ (۲)

(۱) البقرۃ، ۲: ۳۲

(۲) البقرۃ، ۲: ۲۱

’’اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان لوگوں کو (بھی) جو تم سے پیشتر تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۝‘‘

ایک دوسرے مقام پر یہی نکتہ یوں بیان ہوا ہے:

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ۝ (۱)

’’یہی (اللہ) تمہارا پروردگار ہے اس کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں (وہی) ہر چیز کا خالق ہے پس تم اسی کی عبادت کیا کرو اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔‘‘

اس نکتے کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری ہے کہ اِسلام میں عبادت فقط چند فرائض کو انجام دینے تک محدود نہیں بلکہ اس لفظ کے معنی میں بہت وسعت ہے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ اور مملوک اور بعنوان عبادت اس کا فریضہ ہے کہ اپنی ترقی یافتہ علمی اور فکری صلاحیتوں کو فقط مشروع اور جائز اُمور میں صرف کرے۔ لیکن ہر ایسی راہ جو خداوند عظیم کی پسندیدہ نہیں وہ ان صلاحیتوں کو اس میں بروئے کار نہ لائے اور خود کو رب العزت کی سزاؤں کا مستحق نہ بنائے۔ ایک مومن فرد کے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ عبادت کی نیت سے معاشی اُمور میں مصروف عمل ہو۔ وہ اپنی محنت و کاوش کے ساتھ دولت حاصل کرے، باعزت زندگی گزارے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی مستحق اجر و ثواب قرار پائے۔ چونکہ وہ مومن اپنے آپ کو حق تعالیٰ کا مملوک اور اپنی دولت کو اللہ تعالیٰ کی ملکیت سمجھتا ہے لہٰذا وہ پابند ہے کہ اپنے سرمائے سے صرف جائز منافع حاصل کرے، اسے ناروا اُمور میں خرچ نہ کرے اور اپنے آپ کو پروردگار عالم کی ناراضی کا مستحق نہ بنائے۔

خلاصہ یہ کہ اِسلام میں عبادت ایسی چیز ہے جو ایک طرف سے لوگوں کو عقلی، علمی، فکری، روحانی، اخلاقی، معاشی، اجتماعی اور دیگر تمام مدارج کے اعتبار سے متحرک اور

(۱) الانعام، ۶: ۱۰۲

فعال بناتی ہے۔ دوسری طرف وہ ترقی کو اطاعت پروردگار کی چاردیواری کے اندر محدود کر دیتی ہے، یعنی وہ ترقی کو معاشرے کی سعادت و مصلحت کے لئے وقف کر دیتی ہے۔ عبادت یہ اجازت نہیں دیتی کہ تمام مادی یا معنوی سرمائے کو غیر صحیح اور ممنوع مقامات پر کام میں لایا جائے۔ یہ عبادت کا ایک جامع مفہوم ہے اور اس سے بے عیب ترقی ہوتی ہے اور قرآن حکیم کی اس آیت شریفہ کا بھی یہی مطلب ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ○ (۱)

''اور میں نے جنّات اور انسانوں کو صرف اسی لئے پیدا کیا کہ وہ میری بندگی اختیار کریں○''

دورِ حاضر کے انسان نے علمی تحقیقات اور اسرار آفرینش کی اطلاعات میں عظیم کامیابیاں حاصل کی ہیں اور اس راستے میں بلند ترین مدارج تک جا پہنچا ہے۔ اس نے عقل و دانش کی طاقت کے ذریعے عالم طبیعت پر غلبہ پا لیا ہے اور زمین کی اشیاء کو مسخر کر لیا ہے۔ آج کے انسان نے مشینری اور صنعت کی طاقت سے مختلف عناصر طبیعت کو اپنے قبضے میں لے لیا ہے اور اپنی زندگی کو بہتر بنانے اور زیادہ آسائش مہیا کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود یہ ترقی اور یہ کامیابی اس کی خوش بختی اور سعادت کا موجب نہیں بن سکتی اور اس کے لئے قلبی اور فکری اطمینان مہیا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔

انسان کے عدمِ سکون اور اضطراب کی وجہ

آج کے انسان کی زندگی بے چینی، اضطراب اور دیگر گوناگوں مصائب و آلام سے پُر نظر آتی ہے۔ جنگ و خونریزی، قتل و غارت، جارحیت اور سپر پاور کا کمزوروں پر جبر و تسلط ایسے اُمور ہیں جن کے سبب انسان رنج و غم، بے سکونی و بے اطمینانی کا پیکر بن گیا

(۱) الذاریات، ۵۱: ۵۶

ہے اور تقریبا تمام اقوام بالواسطہ یا بلاواسطہ ان مصیبتوں سے دوچار دکھائی دیتی ہیں۔ان تمام مصائب کی بنیاد علم و دانش کی کمی نہیں اور نہ ہی مال و ثروت یا صنعت و حرفت کی قلت ہے۔ بلکہ ان تمام جرائم و مظالم کا سرچشمہ ایمان کی کمی ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہونے کے احساس کا فقدان ہے۔اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا ہے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى○(۱)

''اور جس نے میرے ذکر (یعنی میری یاد اور نصیحت) سے روگردانی کی تو اس کے لئے دنیاوی معاش (بھی) تنگ کر دیا جائے گا اور ہم اسے قیامت کے دن (بھی) اندھا اٹھائیں گے○''

اس سے بڑھ کر اور کیا تنگی ہوسکتی ہے کہ اس جہان کی زیادہ تر ترقی یافتہ اقوام زندگی کے عالی ترین وسائل کی مالک ہیں اور بہترین نعمتیں ان کو حاصل ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ بے اطمینانی اور بے سکونی میں زندگی بسر کرتی ہیں، قلب کو غم اور خوف سے امان نہیں۔اغواء، قتل، خودکشی، چوری، ڈاکہ زنی، ناکامی، شکست اور اس طرح کے دیگر مصائب اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کی زندگی کو تلخ بنائے ہوئے ہیں۔ اب نوبت بایں جا رسید کہ وہ لوگ چند گھنٹے آرام کی نیند سونے کے لئے بھی خواب آور گولیوں کی مدد کے محتاج ہو گئے ہیں۔ ان کی زندگی میں یہ تلخیاں اور سختیاں صرف اس لئے ہیں کہ آج کے انسان نے اپنے خالق و مالک سے منہ موڑ لیا ہے اور وہ خود کو اس کے سامنے جواب دہ نہیں سمجھتا۔ اس دنیا کے انسانوں کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی سے انکار کر کے خواہش نفس کی غیر مشروط بندگی اختیار کر بیٹھے ہیں۔ جاہ طلبی، برتری کی تلاش، شہوت و غضب کی کشش اور دولت کی طرف میلان نے ان کو اس طرح اپنا غلام بنا لیا ہے کہ اب وہ لذائذ

(۱) طٰہٰ، ۲۰: ۱۲۴

وخواہشات کو سیر کرنے کے لئے کسی قسم کی خیانت کی پرواہ نہیں کرتے۔ وہ اپنی نفسانی چاہتوں کے حصول میں ہر انسان دشمن حرکت اور ہر گناہ کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ اپنی علمی اور صنعتی پیش رفت کی وجہ سے جو ترقی و کمال انہیں نصیب ہوا تھا، وہ اپنی پوری درخشندگی اور وسعت کے باوجود ایک عیب دار ترقی، بے راہ روی اور خود سری کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یہ ایک ایسی ترقی ہے جو اپنی تمام توانائیوں سمیت حیوانی لذائذ و شہوت کی خدمت کے لئے وقف ہو چکی ہے۔ اس میں ایمان و حقیقت، حق و فضیلت، انصاف و عدالت اور اس قسم کے دیگر تمام انسانی اخلاقی خصائل و کمالات کا نام و نشان تک نہیں ہے۔

سعادت کا بنیادی رکن امن و امان کا قائم رہنا ہے

اِنسانی زندگی میں سعادت کا اساسی رُکن امن و امان کا قائم رہنا ہے، کیونکہ امن کے ماحول ہی میں مختلف علمی، اقتصادی، صنعتی، اجتماعی اور اخلاقی سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔ امن ہی کے سائے میں عوامی استعدادیں صحیح سمت میں آگے بڑھتی ہیں اور معاشرہ ترقی کی راہیں طے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے اور دین اِسلام کے پیروکار ہمیشہ ایمان کے سائے میں امن تلاش کرتے ہیں۔ جب دین و ایمان کا سرمایہ موجود ہو تو امن اور اطمینان قلب خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مومن افراد میں سے کوئی بھی کسی دوسرے فرد پر تجاوز کو جائز نہیں سمجھتا۔ اس امر کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ○(۱)

’’جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو (شرک کے) ظلم کے ساتھ نہیں ملایا انہی لوگوں کے لئے امن (یعنی اخروی بے خوفی) ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں○‘‘

(۱) الانعام، ۶: ۱۸۲

پھر یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ جب تک فرد اور قوم اپنے آپ کو نہ بدلے اُس وقت تک آسمانی فیصلے بھی اُس کے لئے مقدر ساز نہیں ہوتے۔ نری خالی اُمیدوں سے تبدیلی ممکن نہیں بلکہ اپنے آپ کو ہر اعتبار سے بدلنا پڑتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ. (۱)

''بیشک اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا یہاں تک کہ وہ لوگ اپنے آپ میں خود تبدیلی پیدا کر ڈالیں۔''

اگر انسان خواہش نفس کی پرستش کو چھوڑ دیں اور خدا پرست بن جائیں اگر وہ اپنے لذائذ کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ڈھال لیں اور انہیں خوشنودی خدا اور بھلائی کی حدود میں پابند کر دیں تو یقیناً وہ حیوانی پستی سے نکل کر انسانی بلندی کو پہنچ جائیں گے۔ اس وقت ان کی زندگی صلح وصفائی، امن وآرام اور خوش بختی وسعادت کا محور بن جائے گی۔

ایک ایماندار اور خدا پرست انسان اپنے سمیت پورے جہان کو پروردگار حکیم و دانا کی مخلوق تسلیم کرتا ہے۔ اس کا نظریہ ہوتا ہے کہ اس کا آغاز فیض خداوندی کے ذریعے ہوا اور اس کا انجام بھی اس ہستی کے حضور میں ہوگا۔ ارشاد ہوا:

وَهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ○ (۲)

''اور اسی نے تمہیں پہلی بار پیدا فرمایا ہے اور تم اسی کی طرف پلٹائے جاؤ گے○''

یہ وہ حقیقت ہے کہ جس کا منکر بھی عملاً انکار نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى○ (۳)

''اور یہ کہ (بالآخر سب کو) آپ کے رب ہی کی طرف پہنچنا ہے○''

(۱) الرعد، ۱۳: ۱۱

(۲) حم السجدة، ۴۱: ۲۱

(۳) النجم، ۵۳: ۴۲

ایک مادہ پرست انسان اپنے سمیت سارے جہان کو ایک مادی پیداوار اور طبیعت جیسی اندھی اور بہری شئ کا کرشمہ سمجھتا ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اتفاقی حادثے کے ذریعے پیدا ہونے والے علل ومعلولات کے توسط سے وجود میں آ گیا ہے۔ وہ اس جہان میں چند روز زندگی گزارتا ہے پھر موت آتی ہے تو اس کی کتاب زندگی مکمل طور پر بند ہو جاتی ہے اور اس کا قصہ تمام ہو جاتا ہے۔

آیت الکرسی میں اِس غلط طرزِ فکر کی اصلاح کی گئی ہے اور نظامِ کائنات کی طرف اشارہ کر کے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ انسان کسی بھی چیز کا حقیقی مالک نہیں ہے، سب کچھ اُسی مالک کا عطا کردہ ہے، لہٰذا جب سب کچھ اُسی مالک کا عطا کردہ ہے تو پھر انسان کو بھی اُس کی مرضی کے آگے سرِتسلیم خم کر دینا چاہیے۔

www.MinhajBooks.com